ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

قیمت سالانہ چھ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

رسائل و مسائل

از

سید ابو الاعلیٰ مودودی

یہ کتاب مولانا مودودی کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو ترجمان القرآن میں اسی عنوان کے تحت وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ چونکہ اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور اس میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے مسائل کا حل موجود ہے اس وجہ سے ان مضامین پر مولانا نے ہر طرح کے سوالات قرآن و حدیث کی روشنی میں نہایت مدلل اور مفصل طریق پر دیدئے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے تمام مکاتیب خیال کے لوگوں کے لئے جاذبیت کی حامل ہوگی۔

جلد شائع ہو رہی ہے

موضوعات مندرجہ ذیل ہیں

تفسیر آیات و تاویل احادیث	(۱٦)	مسائل کے جوابات
فقہی مسائل	(۳۳)	,,
خلافیات	(۱۵)	,,
عام مسائل	(٤)	,,
معاشی مسائل	(۱۵)	,,
سیاسی مسائل	(۱۰)	,,

ملنے کا پتہ

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان

اچھرہ۔ لاہور

فہرست مضامین

جلد ۲۷	رجب، شعبان ۱۳۶۴ھ مطابق جولائی، اگست ۱۹۴۵ء	عدد ۱، ۲

سید ابو الاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس چمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دار الاسلام پٹھانکوٹ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

ترجمان القرآن کی پچھلی اشاعت میں تقویٰ پر ہم نے جو مضمون لکھا ہے اس سے یہ بات تو واضح ہو گئی کہ تقویٰ دراصل حدودِ الٰہی کی نگرانی و حفاظت کا نام ہے۔ جو شخص زندگی کے سفر میں، ہر مرحلہ پر، یہ جاننے کی کوشش کرے کہ خدا نے اس کے بڑھنے اور رکنے کے لیے کیا حدود قائم کیے ہیں اور پھر خدا اور روزِ آخرت کے ڈر سے خلوت و جلوت میں ان حدود کی نگرانی کرے اور دیدہ و دانستہ کسی حد کو توڑنے کی جرأت نہ کرے وہ متقی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ بات کس طرح حاصل ہو کہ آدمی اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں، خواہ اس کا تعلق پرائیوٹ زندگی سے ہو یا پبلک سے، مسجد سے ہو یا بازار سے، اخلاق سے ہو یا سیاست سے، اسی طرح اپنے سارے معاملات میں، خواہ ان کا تعلق غریب سے ہو یا امیر سے، دوست سے ہو یا دشمن سے، عزیز سے ہو یا بیگانہ سے، علیٰ ہذا القیاس ہر حال میں خواہ غصہ میں ہو یا محبت میں، تنگی میں ہو یا فراخی میں، خدا کے قائم کیے ہوئے حدود کا اس طرح پابند ہو جائے کہ اگر کبھی جہالت سے بال برابر بھی اس کی پابندی میں فرق آجائے تو ہوش آتے ہی اس وقت تک کے لیے اس پر کھانے اور سونے کی لذت حرام ہو جائے۔ جب تک وہ اپنے غلط سمت میں اٹھائے ہوئے قدم کو واپس نہ لے اور استغفار و توبہ کے ذریعے اصلاح مافات نہ کر لے؟ ظاہر ہے کہ یہ سوال نہایت اہم ہے۔ اسی سوال کا صحیح جواب دین کے خزانہ کی اصلی کلید ہے۔ اور اسی سوال کے جواب سے یہ بات واضح ہو گی کہ ہماری خانقاہیں، جو تقویٰ پیدا کرنے کا واحد ذریعہ خیال کی جاتی ہیں، اس مقصد کے لیے کس حد تک مفید ہیں؟

دنیا میں انبیاء علیہم السلام کا گروہ وہ گروہ ہے جس کا مخصوص کام ہی تقویٰ کی دعوت اور اس کی تعلیم ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلعم کو ابتدائے وحی میں حکم ہوا کہ یا ایھا المدثر قم فانذر (اے چادر لپیٹنے والے کھڑا ہو اور لوگوں کو ڈرا) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذمہ پہلے روز جو کام سپرد کیا گیا یہی تھا کہ وہ فرعون کی قوم کو تقویٰ کی دعوت دیں [اذ نادیٰ ربک موسیٰ ان ایت القوم الظالمین، قوم فرعون الا یتقون] (جب کہ تیرے رب نے پکارا موسیٰ کو کہ ظالم قوم کے پاس جاؤ، فرعون کی قوم کے پاس کیا وہ تقویٰ نہیں اختیار کریں گے۔) حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کا ذکر ان الفاظ کے ساتھ ہوا ہے [کذبت قوم نوح المرسلین، اذ قال لھم اخوھم نوح الا تتقون، انی لکم رسول

امین فاتقوا اللہ واطیعون] (نوح کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا، جب کہا ان کے بھائی نوح نے کہ تم تقویٰ نہیں اختیار کرتے، میں تمھارے لیے ایک امین رسول ہوں پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو) بعینہٖ یہی بات حضرت ہودؑ کی دعوت میں دو مرتبہ، صالحؑ کی دعوت میں دو مرتبہ اور لوط و شعیب علیہم السلام کی دعوت میں دو دو مرتبہ بیان ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تقویٰ تمام انبیائے کرام علیہم السلام کی دعوت کا بالکل ابتدائی نقطہ ہے۔ ہر نبی جو آتا ہے وہ اپنی قوم کو جس بات کی سب سے پہلے دعوت دیتا ہے وہ یہی ہے کہ اے لوگو تقویٰ اختیار کرو۔ پس تقویٰ کی تعلیم کا صحیح طریقہ معلوم کرنے کے لیے یہ دیکھنا چاہیے کہ حضرات انبیائے کرام لوگوں میں کس طرح تقویٰ پیدا کرتے ہیں۔

ہم نے جہاں تک حضرات انبیاء کے طریقہ تعلیم تقویٰ کو قرآن مجید سے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ یہ حضرات اپنے زمانہ کی فسق و فجور سے بھری ہوئی دنیا پر جب نظر ڈالتے ہیں اور انسان کی خدا سے بغاوت و سرکشی اور شہوات نفس کی پیروی میں آزادی و بے قیدی کے اسباب پر غور کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان پر یہ حقیقت واضح فرماتا ہے کہ انسان کی ان تمام سرکشیوں اور تعدیوں کی تہ میں تین چیزیں کام کر رہی ہیں۔ پہلی یہ ہے کہ لوگوں میں خدا اور اس کی صفات کا تصور بالکل غلط ہو کے رہ گیا ہے۔ دوسری یہ کہ لوگوں میں اس زندگی کے بعد کسی زندگی کا یا تو سرے سے تصور ہی نہیں ہے اور اگر ہے تو اس تصور میں ایسی خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں کہ اس کی گرفت انسان کی عملی زندگی پر بالکل باقی نہیں رہی ہے۔ تیسری یہ کہ لوگوں میں سرے سے اللہ تعالیٰ کے حدود و محارم کا علم ہی مٹ گیا ہے۔ لوگ جانتے ہی نہیں کہ ان کے نفس کی خواہشوں اور دلوں کی چاہتوں پر کوئی روک بھی ہے۔ پس حضرات انبیائے کرام اپنی ساری قوت ان تینوں چیزوں کی اصلاح پر صرف کرتے ہیں اور جس رفتار سے وہ خدا اور اس کی صفات، آخرت اور اس کے نتائج، احکام الٰہی اور اس کے مصالح لوگوں پر واضح کرتے جاتے ہیں اسی رفتار سے لوگوں میں تقویٰ پیدا ہونے لگتا ہے یہاں تک کہ جب انبیائے کرام اپنے کام سے فارغ ہو کر دنیا سے رخصت ہوتے ہیں تو اپنے پیچھے متقیوں کا ایک ایسا گروہ چھوڑ جاتے ہیں جو مدتوں تک اس تقویٰ کی حرارت کو لوگوں میں باقی رکھتا ہے۔

یہاں ہم ان تینوں چیزوں کی کسی قدر تفصیل کر دینا چاہتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ خدا، آخرت اور حدود الٰہی کے علم میں کس طرح کی غلطیاں ہیں جن کی حضرات انبیائے کرام کو اصلاح کرنی پڑتی ہے اور جن کی اصلاح کے بغیر تقویٰ کا پیدا ہونا ناممکن ہے!

۱- پہلی چیز یعنی خدا کے تصور کا جب یہ حضرات اپنے گرد و پیش کی دنیا پر نظر ڈال کر جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یا تو لوگ سرے سے خدا کو مان ہی نہیں رہے ہیں۔ یا مان رہے ہیں تو اس طرح مان رہے ہیں کہ اس طرح ماننے اور نہ ماننے میں نتیجہ کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں۔ مثلاً جو لوگ خدا کو مانتے ہیں وہ صرف اس حد تک مانتے ہیں کہ وہ آسمان و زمین کا خالق ہے۔ یہ نہیں مانتے کہ وہی تناسب کا مالک اور حاکم بھی ہے۔ یا یہ تو مانتے ہیں کہ ہر چیز کو وجود اسی نے بخشا ہے لیکن یہ نہیں مانتے کہ وہی تناسب کا محافظ و نگراں بھی ہے۔ ان کے نزدیک اس میں کوئی حیثیت نہیں کہ آسمان کے عرش حکومت

[illegible]نا ہو اور زمین کا انتظام وہ اپنے دوسرے مقربین کے حوالہ کرکے اس سے بالکل غیر متعلق ہو جائے۔ اسی طرح وہ خدا کو بھی مانتے ہیں اور اس کے ساتھ اس کے دوسرے سیکڑوں شریکوں کو بھی مانتے ہیں جن کو اس کے دربار میں ایسی رسائی اور تقرب حاصل ہے کہ جس کو چاہیں معاف کرا دیں اور جس کو چاہیں سزا دلا دیں۔ اس کی عبادت کا حق ان کے نزدیک اس سے ادا ہو جاتا ہے کہ مخصوص اوقات میں اس کی پوجا کر لی جائے یا اس کو خوش کرنے کے لیے اس کے حضور میں کوئی نذر گذران دی جائے یا کوئی قربانی پیش کر دی جائے۔ اس عبادت کے مقتضیات میں سے نہ تو یہ بات ہے کہ تنہا اسی کی اطاعت اور غلامی کی جائے اور نہ وہ خدا کی صفات کا یہ کوئی لازمی تقاضا سمجھتے کہ وہ خلق کی ہدایت کے لیے کوئی قانون و کتاب اور کوئی نبی و رسول بھیجے اور انسانوں پر اس کی اطاعت لازمی ہو۔ علیٰ ہذا القیاس وہ خدا کو خالق مانتے ہیں لیکن یہ نہیں مانتے کہ وہ مارنے کے بعد دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے۔ یا انسان کے تمام کھلے اور چھپے سے واقف ہے۔ یا اس کے ہر کام میں حکمت ہے یا وہ عادل اور قسط کو قائم کرنے والا ہے یا دوسروں کے خوف و لحاظ اور ان کی مدد و اعانت سے بالکل مستغنی ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کو نہ ماننے والے اور اس طرح ماننے والے نتیجہ کے لحاظ سے، یعنی خدا سے بے خوفی میں، دونوں برابر ہیں۔ پہلا گروہ اس وجہ سے بے پروا ہے کہ وہ خدا کو مان ہی نہیں رہا ہے اور دوسرا اس وجہ سے مستغنی ہے کہ اس نے خدا سے بچنے کے لیے صدہا راستے پیدا کر لیے ہیں اس وجہ سے انبیائے کرام پہلے گروہ میں خدا کا اعتقاد پیدا کرتے ہیں اور دوسرے گروہ کے عقیدہ کی اصلاح کرتے ہیں کیونکہ جب تک خدا پر سچا اور پکا ایمان نہ ہو اور وہ ایمان شرک کی تمام آلائشوں سے بالکل پاک نہ ہو اس وقت تک خدا سے تقویٰ ایک بالکل بے معنی لفظ ہے۔ جو شخص خدا کو تنہا مالک اور حاکم مان ہی نہیں رہا ہے آخر وہ اس کی اطاعت و بندگی کیوں کرے؟ جو شخص اس کو علیم و خبیر یقین ہی نہیں کر رہا ہے وہ خلوت و جلوت میں اس سے اس طرح ڈرتا کیوں رہے کہ اس کے کسی حکم کی ادنیٰ خلاف ورزی بھی نہ ہونے پائے؟ اور بالفرض وہ پبلک میں کسی مصلحت سے کوئی کھلی ہوئی نافرمانی نہ کرے لیکن آخر تنہائی میں اس کا خوف اپنے اوپر کیوں مسلط رہنے دے؟ جو شخص اس بات پر عقیدہ رکھتا ہی نہیں کہ خدا عادل اور قسط کو قائم کرنے والا ہے وہ ظلم و ناانصافی سے کیوں ڈرے؟ جو شخص اس بات کا قائل ہی نہیں کہ خدا کو ہماری روزمرہ زندگی سے کوئی تعلق ہے، اور اس نے ہماری اس زندگی کو حدود کے اندر پابند رکھنے کے لیے کچھ قوانین اتارے ہیں، آخر وہ خدا سے ہر قدم پر کانپتا کیوں رہے؟ جس شخص کا اس بات پر ایمان ہی نہیں کہ خدا ہی حاکم علی الاطلاق، بادشاہ اور قانون ساز ہے۔ آخر وہ اپنی یا دوسروں کی حکومت اور قانون سازی کو بغاوت کیوں سمجھے؟ اس وجہ سے تقویٰ پیدا کرنے کے لیے سب سے مقدم چیز یہ ہے کہ خدا کی ذات، اس کی صفات اور اس کے حقوق کا صحیح صحیح علم پیدا کیا جائے اس کے بغیر تقویٰ پیدا کرنے کی ساری تدبیریں بالکل اوپری ہوں گی جن سے ممکن ہے خانقاہی قسم کا ایک بالکل غیر متوازن تقشف تو پیدا ہو جائے لیکن وہ تقویٰ ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا جو حدود الٰہی کی کامل محافظت سے عبارت ہے اور جس کو پیدا کرنے کے لیے حضرات انبیائے کرام تشریف لائے تھے۔

(۲) دوسری چیز یعنی عقیدۂ آخرت کا، جب انبیائے کرام جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ لوگ یا تو سرے سے موت کے بعد کسی زندگی اور روزِ حساب کے قائل ہی نہیں رہے ہیں اور اگر قائل ہیں تو صرف ایک مفروضہ کے درجہ میں قائل ہیں اور یہ مفروضہ بھی ان کے اندر خدا اور اس کے حدود کا احترام اور خوف پیدا کرنے میں بالکل بے اثر ہے کیونکہ اگر ایک طرف وہ یہ مانتے ہیں کہ اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی ہے جس میں اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی پڑے گی تو دوسری طرف شرکاء و انداد کی شفاعت کے بھی قائل ہیں جن کی نسبت ان کا اعتقاد ہے کہ وہ خدا کے ہاں اس قدر زور و اثر رکھتے ہیں کہ وہ اپنے پرستاروں کو بہر حال خدا سے بخشوا لیں گے۔ دوسرے بعض ایسے ہیں جو اپنے نسب ہی کو اپنی نجات کے لیے بالکل کافی سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان کے آباء و اجداد خدا کے محبوب تھے اس وجہ سے وہ بھی اللہ کے محبوب اور چہیتے بن گئے ہیں اس وجہ سے اول تو خدا کی جہنم کے وہ سزاوار نہیں اور اگر سزاوار ٹھہرے بھی تو زیادہ سے زیادہ چند دنوں کے لیے۔ بعض دوسرے اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہیں کہ انسان فطری گنہگار ہے۔ اس کے پاک اور متقی ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انسان کے ساتھ عدل کا معاملہ نہیں کیا ہے بلکہ رحم کا معاملہ کیا ہے اور اس کی نجات کے لیے اس نے اپنے محبوب بیٹے کو بھیجا جو سولی پر چڑھ کر تمام انسانوں کے لیے کفارہ ہو گیا۔ اب انسانوں کی نجات کے لیے کسی پرہیزگاری اور تقویٰ، کسی بندگی و اطاعت کی ضرورت نہیں ہے، صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ لوگ خدا کے بیٹے پر ایمان لائیں۔ جو اس پر ایمان لائے گا وہ نجات پائے گا اگرچہ اس سے ایک نیکی بھی صادر نہ ہوئی ہو اور جو شخص اس پر ایمان نہیں لائے گا وہ نجات سے محروم رہے گا اگرچہ اس سے ایک برائی بھی سرزد نہ ہوئی ہو۔ دوسرے بعض ایسے ہیں جو اگرچہ آخرت کے قائل ہیں لیکن اس کو اس قدر دور سمجھتے ہیں کہ اس کے لیے کسی تقویٰ اور پرہیزگاری کا اہتمام بالکل فضول سمجھتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو نجات اپنے گروہ کا حق سمجھتے ہیں۔ جو ان کے اندر شامل ہے اس کی نجات ہو گی خواہ اس کے اعمال کچھ ہوں، جو ان سے باہر ہے وہ نجات سے محروم ہے اگرچہ وہ کتنا ہی نیک ہو۔ ظاہر ہے کہ جو شخص آخرت کا سرے سے قائل ہی نہیں ہے اور اپنے آپ کو بالکل غیر مسئول اور مطلق العنان سمجھ رہا ہے اس سے تقویٰ کا مطالبہ بالکل بے معنی ہے اور اگر آخرت کا تو قائل ہے لیکن غلط شفاعت کے چکر میں پڑا ہوا ہے یا نسب کے غرور اور گروہ کی عصبیت میں مبتلا ہے یا خدا کے رحم اور عدل کا تصور اس کے دماغ میں غلط ہو کے رہ گیا ہے تو اس کو بھی تقویٰ کی دعوت دینا بالکل بے معنی ہے۔ ان میں سے ہر واہمہ تقویٰ کی جڑ اکھاڑ دینے کے لیے کافی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ایک ایسی شفاعت کا یقین لیے بیٹھا ہے جو باطل کو حق اور حق کو باطل بنا دے گی اس کو خدا سے ڈرنے کی کیا ضرورت؟ جو شخص اس خبط میں مبتلا ہے کہ اسے جو کچھ حاصل ہے اس کے نسب اور اس کے استحقاق ذاتی کا کرشمہ ہے۔ دنیا میں بھی حاصل ہے اور آخرت میں بھی حاصل رہے گا اسے خدا کی پرسش کی کیا پروا ہو سکتی ہے؟ اسی طرح اگر کسی کے دماغ میں خدا کے رحم کا ایک غلط تصور پیدا ہو گیا ہے اور وہ خدا کے عدل کو اس کے رحم ہی کا مظہر نہیں سمجھتا ہے تو وہ خدا سے ڈرے گا کیوں؟ ایسے لوگوں کے اندر تقویٰ پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے اندر اولاً تو عقیدۂ آخرت کو راسخ کیا جائے ثانیاً ان تمام رخنوں کو بند کیا جائے جو اس عقیدے کے تمام اثر کو باطل کر دینے والے ہیں۔ چنانچہ حضرات انبیائے کرام ان لوگوں کو پہلے ایمان بالآخرت کی دعوت دیتے ہیں اور آخرت کے

قطعی ہونے پر آفاق و انفس سے ایسے دلائل پیش کرتے ہیں جن کا انکار صرف ایک ہٹ دھرم ہی کر سکتا ہے اور ساتھ ہی ان تمام غلط توہمات کی ایک ایک کرکے بیخ کنی کرتے ہیں جو انسان میں غلط قسم کی بے پروائی اور جسارت پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً شفاعت کے غلط تصور کی پوری وضاحت کے ساتھ تردید کر دیتے ہیں کہ خدا کے ہاں کوئی آدمی یا فرشتہ بغیر اس کی اجازت کے کسی کی شفاعت نہیں کر سکے گا اور جس کو شفاعت کی اجازت دی جائے گی وہ صرف سچی بات کہہ سکے گا کوئی بات خلاف حقیقت نہ کہے گا۔ اور کوئی شفاعت نہ حق کو باطل کر سکے گی نہ باطل کو حق، علیٰ ہذا القیاس نسب و حسب خدا کے یہاں کچھ کام نہ آئے گا وہاں صرف عمل و اطاعت کی پوچھ ہوگی۔ جو لوگ عمل کے لحاظ سے بھرپور ہوں گے وہ خدا کے یہاں اسی لحاظ سے اونچے سے اونچا درجہ پائیں گے اگرچہ نسب و خاندان کے اعتبار سے نیچے درجہ ہی کے گنے جاتے ہوں۔ اور جو لوگ عمل سے خالی ہوں گے وہ خدا کے ہاں محروم و نامراد ہوں گے اگرچہ انھیں حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر ہی کی اولاد میں ہونے کا شرف حاصل ہو۔ نیز وہ یہ حقیقت بھی اچھی طرح واضح کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی کا یہ تقاضا ہے کہ وہ ایک انصاف کا دن لائے جس میں مظلوموں کی دادرسی کرے اور ظالموں کو ان کے کیے کا بدلہ دے۔ اس کی رحمت کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ ظالموں اور سرکشوں کو معاف کر دے۔ اگر وہ ایسا کرے تو نہ وہ عادل ہے نہ رحیم ہے۔

---

(۳) ان دونوں کاموں سے فارغ ہونے کے بعد حضرات انبیائے کرام جب اللہ تعالیٰ کے حدود کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حدود و قوانین شریعت کا بڑا حصہ بالکل مٹ چکا ہے۔ اللہ کا حرام کیا ہوا حلال ہے۔ اس کا حلال کیا ہوا حرام ہے۔ جو بات اس کی نظروں میں مبغوض تھی وہ محبوب بن گئی ہے، جو محبوب تھی مبغوض بن چکی ہے۔ زندگی کے ہر گوشہ میں معروف منکر بن چکا ہے اور منکر نے معروف کی جگہ لے رکھی ہے۔ معاش میں، معیشت میں، عدل میں، سیاست میں، تہذیب میں، معاشرت میں، تعلیم میں، تربیت میں، عادات و اخلاق میں، اٹھنے بیٹھنے میں، چلنے پھرنے میں، ہنسنے بولنے میں ہر جگہ شیطان نے گھس کر انڈے بچے دیدیے ہیں اور سارا نظام زندگی فاطر اور فطرت کے منشا کے بالکل خلاف ہو کے رہ گیا ہے۔ چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے زندگی کے ایک ایک گوشہ کی چھان بین کرتے ہیں اور ہر گوشہ کو غیر فطری اور غیر الٰہی عادات و رسوم سے بالکل پاک کرکے فطرت اور شریعت کے بالکل مطابق کرتے ہیں۔

حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے یہاں تقویٰ پیدا کرنے کا طریقہ یہی ہے۔ آنحضرت صلعم کی بعثت کی زندگی پر ایک سرسری نظر ڈال کر آدمی اس بات کی تصدیق کر سکتا ہے۔ مکی زندگی میں آپ نے جس طرح لوگوں کو تقویٰ کی تعلیم دی مکی سورتوں میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے۔ ہر آدمی ان سورتوں کو سرسری طور پر پڑھ کر معلوم کر سکتا ہے کہ یہ سرتا سر خدا، اس کی توحید، اس کی صفات حسنیٰ اور آخرت کے دلائل و احوال سے لبریز ہیں۔ اور اتنی قوت و شدت اور اتنی گوناگوں شکلوں میں ان سورتوں کے اندر یہ مطالب بیان ہوئے ہیں کہ جن لوگوں کو اول اول یہ سورتیں سنائی گئیں ان کے لیے اس دعوت سے بے پروا رہنا اور اپنی طفل تسلیوں کے فریب میں بدستور غافل پڑے رہنا ناممکن ہو گیا۔ ان کے لیے صرف دو ہی صورتیں

ممکن رہ گئی تھیں یا تو داعی کی دعوت پر لبیک کہیں اور غفلت کے بستروں کو چھوڑ کر خدا کی طرف بھاگیں یا پھر پوری قوت سے اس پُراثر دعوت کو دبا دیں جس نے ان کے لیے چین کی نیند حرام کر دی ہے۔ چنانچہ ان صورتوں کے نزول کے بعد پورے عرب میں ایک شخص بھی اسلامی دعوت کے بارہ میں غیر جانبدار نہیں رہ گیا تھا یا تو اس کا جان و دل سے مخالف بن کر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اس کو مٹائے بغیر اس کے لیے خواب و خور حرام تھا یا اتنا شدید حامی کہ سب کچھ گوارا تھا لیکن اگر نہیں گوارا تھی تو یہ بات کہ کوئی قدم بھی تقویٰ کے خلاف اٹھے۔ تقویٰ کا اس درجہ شدید احساس کہ خدا کے حکم کی تعمیل کی راہ میں ہر جوکھم آسان ہو گئی، صرف اس چیز کا نتیجہ تھا کہ خدا اور آخرت کے بارے میں ان کا علم بالکل صاف ہو گیا تھا۔ اتنا صاف کہ اس کے بعد ان کے لیے خدا کی طرف بھاگ کھڑے ہونے کے سوا کوئی صورت باقی ہی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ جس جنت الحمقاء میں اب تک پڑے سو رہے تھے، انھیں دفعۃً نظر آیا کہ اس کے گوشہ گوشہ میں آگ لگ چکی ہے اب اگر جان بچانے کی کوئی شکل ہے تو صرف یہی کہ جس دروازہ پر پیغمبر کھڑا بلا رہا ہے اس کا رخ کیا جائے۔ جو لوگ بظاہر مخالفت پر کمربستہ تھے ان کی مخالفت بھی ان گھبرائے ہوئے اور بدحواس لوگوں کی دوڑ دھوپ کے مانند تھی جو آگ کے خطرہ سے تو بچنا چاہتے ہوں لیکن نجات کے جس راستہ کی طرف نبی دعوت دے رہا ہو اس کی طرف جانے سے اس وجہ سے گھبراتے ہوں کہ اس راستہ سے ان کو اس بات کی اجازت تو ہے کہ وہ اپنی جانیں بچا لے جائیں لیکن اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ اپنے سارے اثاث البیت کے ساتھ نکل سکیں۔ چونکہ دنیا کی محبت ان پر غالب تھی اس وجہ سے باوجودیکہ حق ان پر واضح تھا لیکن وہ حق کا ساتھ نہ دے سکے۔

اس ساری تفصیل سے دو باتیں واضح ہوئیں۔ پہلی یہ کہ اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت اور آخرت کا صحیح علم آدمی کے اندر وہ بےچینی پیدا کرتا ہے جس سے وہ خدا کی طرف بھاگتا ہے جو تقویٰ کی اصل حقیقت ہے اور دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور آخرت کا صحیح علم ہی وہ پاسبان ہے جو آدمی کے دل کے اندر بیٹھ کر اس کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ خدا کے احکام و قوانین کی پوری پابندی کرے اور کسی جگہ بھی سرِمو اس کے حدود سے تجاوز نہ کرے۔ اگرچہ یہ باتیں بالکل واضح ہیں لیکن قرآن مجید سے یہاں ہم بعض آیتیں نقل کیے دیتے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ تقویٰ کے پیدا ہونے اور باقی رہنے کا انحصار سرتاسر اللہ تعالیٰ کی صفات اور آخرت کے صحیح علم و یقین پر ہے۔

پہلے ہم بعض وہ آیتیں نقل کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ تقویٰ کا پیدا ہونا اللہ تعالیٰ کی صحیح صفات کے علم پر منحصر ہے۔ سورہ بقرہ میں طلاق کے احکام و قوانین کے بیان کے بعد فرمایا:-

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (بقرہ ۲۳۱) اور اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ اللہ ہر بات کو جاننے والا ہے۔

اس آیت میں تقویٰ کا حکم دینے کے بعد اللہ تعالیٰ کی صفت علم کی یاددہانی کی گئی ہے۔ کیونکہ خدا کے حدود کی پوری حفاظت وہی کر سکتا ہے جو یہ مانتا ہو کہ اللہ تعالیٰ ہر بات سے باخبر ہے۔ یہ چیز دو مختلف پہلوؤں سے آدمی کے اندر تقویٰ پیدا کرتی ہے۔ جہاں کہیں انسان کا نفس کسی خیانت یا جسارت پر اکساتا ہے وہاں اللہ تعالیٰ کی صفت علم کا تذکر آدمی میں خدا کا

خوف پیدا کرتا ہے اور جہاں کہیں آدمی اللہ تعالیٰ کے حدود کی پابندی کے لیے بازیاں کھیلتا ہے، مصائب جھیلتا ہے، نقصانات گوارا کرتا ہے وہاں یہ یقین کہ اللہ تعالیٰ اس کی ان جاں بازیوں کو دیکھ رہا ہے اس میں اعتماد و قوت پیدا کرتا ہے۔

پھر احکام رضاعت کے ذکر کے بعد فرمایا:-

اِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (بقرہ ۲۳۳)

اگر تم چاہو کہ اپنے بچوں کو دودھ پلواؤ تو تم پر کوئی ہرج نہیں ہے بشرطیکہ ادا کرو جو تم نے دیا ہے دستور کے مطابق اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یاد رکھو کہ اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کو دیکھنے والا ہے۔

اس آیت میں، تقویٰ پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے بصیر ہونے کی یاد دہانی کی گئی ہے۔ اس صفت کا علم بھی آدمی میں ان ہی دو پہلوؤں سے تقویٰ پیدا کرتا ہے جن کا ذکر اوپر ہوا۔

وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ

اور چاہیے کہ وہ شخص لکھوائے جس پر حق عائد ہوتا ہے اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے۔

اس آیت میں تقویٰ پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت یعنی اس کے مالک و حاکم ہونے کو یاد دلایا گیا ہے۔

فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ (۲۸۳ - بقرہ)

پس چاہیے کہ جس شخص کے پاس امانت رکھی گئی ہے وہ امانت ادا کر دے اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (۷۶ - آل عمران)

ہاں جس نے اپنے عہد کو پورا کیا اور تقویٰ اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ متقیوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس آیت میں اہل تقویٰ کی حوصلہ افزائی کے لیے اللہ تعالیٰ کی اس صفت کو یاد دلایا گیا ہے کہ وہ متقین سے محبت کرتا ہے۔

يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۔ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ (۱۱۴ - ۱۱۵ آل عمران)

اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، معروف کا حکم دیتے ہیں، منکر سے روکتے ہیں، بھلائی کے کاموں میں مسابقت کرتے ہیں، وہی لوگ نیکوکاروں میں سے ہیں اور جو بھلائی کے کام وہ کریں گے اس کا انکار نہ کیا جائے گا اور اللہ متقیوں سے باخبر ہے۔

یہاں تقویٰ کے اصلی کام بھی بتا دیے ہیں اور ان کاموں میں جو جوکھم ہے اس کو برداشت کرنے کے لیے جس اعتماد اور قوت کی ضرورت ہے وہ بھی دو لفظوں میں بخش دی کہ اللہ متقین سے باخبر ہے یعنی جو لوگ تقویٰ کی خاطر قربانیاں کریں گے اللہ تعالیٰ ان سے اچھی طرح باخبر ہے ان کی محنتوں کا پورا صلہ دے گا۔

يٰٓاَيُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَاۗءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَاۗءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا

اے لوگو اپنے اس رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور بنایا اسی سے اس کا جوڑا اور پھیلائے ان دونوں سے بہت سے مرد اور بہت سی عورتیں اور اس اللہ سے ڈرو جس کے واسطے سے تم ایک دوسرے سے طالب مدد ہوتے ہو اور رحم سے بے شک اللہ تم پر نگراں ہے۔

یہاں تقویٰ پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت رقیب کو یاد دلایا ہے یعنی وہ ہر شخص کی اور اس کے ہر قول

وضل کی نہایت کڑی نگرانی کر رہا ہے۔

وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا (۲۹ - النساء)

اور اگر تم احسان کروگے اور تقویٰ اختیار کروگے تو اللہ تمہارے اعمال کی خبر رکھنے والا ہے۔

وَلَقَدْ وَصَّیْنَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَاِیَّاکُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰہَ وَاِنْ تَکْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ

اور ہم نے وصیت کی ان لوگوں کو جن کو کتاب دی گئی تم سے پہلے اور تم کو کہ اللہ سے ڈرو اور اگر تم کفر کروگے تو یاد رکھو کہ اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔

اس آیت میں تقویٰ پیدا کرنے کے لیے اس بات کی یاد دہانی کی گئی ہے کہ آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔

وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ (الطلاق)

اور جو اللہ سے ڈرے گا اس کے لیے راہ پیدا کرے گا اور اس کو بات سے روزی دے گا جہاں سے اس کو گمان بھی نہ ہوگا۔

تقویٰ پر قائم رہنے کے لیے، بالخصوص ایسے مواقع میں جہاں آدمی کو مالی و معاشی مشکلات کا سامنا ہو۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی اس صفت کو یاد دلایا گیا ہے کہ وہ وہاں سے روزی کا سامان کرتا ہے جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہوتا۔

اب ان آیات پر غور فرمایئے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تقویٰ پیدا کرنے اور تقویٰ پر قائم رکھنے کے لیے آخرت کا صحیح علم و یقین اور اس کا تذکر ضروری ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّکُمْ مُّلٰقُوْہُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ (۲۲۳ بقرہ)

اللہ سے ڈرو اور یاد رکھو کہ تمہیں اس سے ملنا ہے اور مومنین کو خوشخبری دو۔

وَاذْکُرُوا اللّٰہَ فِیْٓ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ لِمَنِ اتَّقٰی وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّکُمْ اِلَیْہِ تُحْشَرُوْنَ -۲۰۳

اور اللہ کو یاد کرو گنتی کے چند دنوں میں تو جس نے جلدی کی دو دنوں میں تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جس نے تاخیر کی تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ یہ انھی کے لیے ہے جو تقویٰ پر قائم رہیں اور تقویٰ اختیار کرو اور یاد رکھو کہ تم خدا کے پاس اکٹھے کیے جاؤ گے۔

وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ (۲ - مائدہ)

اور حق اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کرو اور حق تلفی اور زیادتی کی باتوں میں تعاون نہ کرو اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ شدید پاداش والا ہے۔

فَکُلُوْا مِمَّآ اَمْسَکْنَ عَلَیْکُمْ وَاذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ عَلَیْہِ وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ

پس کھاؤ اس میں سے جو تمہارے لیے روک رکھیں اور اس پر اللہ کا نام لو اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ جلد حساب چکانے والا ہے۔

ان تمام آیات میں تقویٰ کا مطالبہ کیا ہے اور ساتھ ہی یاد دہانی کی ہے کہ "خدا سے ملنا ہے" "اس کے پاس اکٹھے ہونا ہے" "وہ سخت پاداش والا ہے" "جلد حساب چکانے والا ہے"۔ کیونکہ انہی صفات کے یقین اور ان کی یادداشت سے تقویٰ پیدا ہوتا ہے۔

اس ساری تفصیل سے یہ بات واضح کرنی مقصود ہے کہ حضرات انبیائے کرام جن کا اصلی کام ہی لوگوں میں تقویٰ پیدا کرنا تھا، انھوں نے اپنے اپنے زمانوں میں لوگوں کو جس تقویٰ کی دعوت دی وہ تقویٰ یہی تھا کہ لوگ اللہ کے حدود و احکام کے پابند ہو جائیں۔ اس کی نافرمانی و بغاوت سے توبہ کریں۔ نہ اپنی خواہشوں کی پیروی کریں نہ ان لوگوں کے پیچھے چلیں جو اپنی خواہشوں کے پیچھے چلتے ہیں۔ زندگی کے تمام گوشوں میں اس قانون کی پیروی کریں جو اللہ نے اتارا ہے اور اس بات سے ڈرتے رہیں کہ اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی بھی ہے جس میں ہر شخص کو خدا کے سامنے اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی پڑے گی اور ہر شخص کی نیکی یا بدی اس کے سامنے آئے گی۔

اس تقویٰ کو پیدا کرنے کے لیے انھوں نے لوگوں میں اللہ اور روزِ آخرت کا یقین پیدا کیا، خدا اور اس کے اسماء و صفات کی تعلیم دی۔ جو منکر تھے ان کے انکار کو توڑا۔ جو متردد تھے ان کے تردد کو دور کیا، جو مشرک تھے ان کے شرک کا ابطال کیا۔ یہاں تک کہ جو خدا عرش آسمان پر براجمان تھا العیاذ باللہ زمین کے معاملات کی اسے کوئی خبر تھی، نہ ان سے اس کو کوئی دلچسپی تھی۔ وہ سمیع و بصیر، حفیظ و رقیب، اور عزیز و حکیم خدا بن کر آسمان و زمین کے سارے معاملات کی نگرانی کرنے لگا۔ جس خدا کی بابت لوگ صرف یہ سمجھتے تھے کہ اس نے پیدا کیا اور پیدا کر کے اس دنیا کے نیک و بد سے بے تعلق ہو گیا ہے اس کو اس حیثیت سے ماننے لگے کہ وہی تنہا اس کائنات پر ہر آن متصرف ہے۔ اس نے جس طرح لوگوں کو پیدا کیا ہے اور ان کی زندگی کے وسائل مہیا کیے ہیں، اسی طرح ان کی ہدایت کے لیے انبیاء بھی بھیجے ہیں، اور رہنمائی کے لیے قانون بھی نازل کیا ہے اور جس طرح وہ سب کا معبود ہے اسی طرح وہ سب کا رب، مالک، اور بادشاہ بھی ہے۔ اور جس طرح اس نے یہ زندگی بخشی ہے اسی طرح مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرے گا اور اس زندگی کا حساب لے گا اور وہ دن ایسا ہوگا کہ خدا کے عدل سے کوئی چیز نہ بچا سکے گی، نہ کسی کی دوستی، نہ کسی کی سفارش، نہ کسی کا فدیہ اور معاوضہ۔ وہ تنہا مالک ہوگا اور سب مملوک و محکوم ہوں گے وہی بادشاہ ہوگا اور سب تابعدار اور رعیت ہوں گے۔

ان باتوں کو دلوں میں راسخ کرنے کے لیے انھوں نے جو طریقہ اختیار کیا وہ ایک طرف تو کمال درجہ علمی و استدلالی تھا یعنی ہر دعوی کا ثبوت، ہر شبہ کا جواب، ہر اعتراض کی تردید، عقل کی رو سے، تاریخ کے پہلو سے، آفاق کی جہت سے، انفس کی طرف سے اور دوسری طرف کمال درجہ عملی تھا یعنی توحید، معاد، رسالت کے جو حقائق سامنے آئے اور ان کو جن لوگوں نے قبول کر لیا ان کی ساری زندگی انہی اصولوں پر ڈھل گئی۔ اب ان کی زندگی کا کوئی قول و فعل ان اصولوں سے متناقض نہیں رہ گیا۔ وہ اپنی زندگی کے بڑے سے بڑے مسائل سے لے کر حقیر سے حقیر جزئیات تک میں مومن بالغیب، مومن بالآخرت اور مومن بالرسول تھے۔ اگر کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی ان کی زندگی کے اندر ان حقائق سے متناقض ہوتی تو وہ کانٹے کی طرح ان کے دلوں میں کھٹکتی جب تک کہ وہ نکل نہ جاتی۔ اور کوئی معمولی سے معمولی بات بھی اگر ان کے سامنے پیش کی جاتی جو ان اصولوں سے مطابق ہوتی تو وہ اس کو اس طرح لپک کے قبول کرتے گویا وہ ان کی متاع گم شدہ تھی جس کی تلاش میں وہ مدتوں سے سرگرداں تھے۔

ہمارے سامنے بھی ایک دنیا ہے جو فسق و فجور سے بھری ہوئی ہے۔ جس کے افکار و نظریات یکسر باطل اور اعمال و اخلاق یکسر نفس پرستانہ ہیں۔ خدا پر ایمان یا تو سرے سے موجود ہی نہیں ہے یا موجود ہے تو اس میں صد بار رخنے ہیں۔ آخرت کو لوگ یا تو سرے سے مان ہی نہیں رہے ہیں یا مان رہے ہیں تو اس طرح کہ اس کا ماننا نہ ماننا دونوں برابر ہے۔ اللہ رسول، اور آخرت کا اقرار نہیں بلکہ انکار دین بن چکا ہے اور یہ دین انکار و الحاد اپنی پشت پر نہایت زبردست فلسفہ رکھتا ہے، اس کی ترویج و اشاعت کے لیے بڑے بڑے کالج اور بڑی بڑی یونیورسٹیاں قائم ہیں، نہایت وسیع الاثر پریس ہے، اور پھر سب سے بڑھ کر نہایت ہی طاقتور سیاسی اقتدار ہے جو تمام امور دنیا کا مالک، تمام وسائل و ذرائع پر متصرف، تمام نفع و ضرر کا خداوند ہے۔ اس دنیا کے اندر کچھ تھوڑے سے مسلمان بھی جی رہے ہیں جو اس میں شبہ نہیں کہ اللہ کا نام بھی لیتے ہیں، رسول کا دم بھی بھرتے ہیں اور آخرت کا بھی ذکر کرتے ہیں لیکن اس اعتبار سے دونوں برابر ہیں کہ عملی زندگی سے خدا اور رسول کو دونوں نے الگ کر رکھا ہے۔ مسلمان نام تو خدا اور رسول کا ضرور لیتا ہے لیکن کام انہی کے کرتا ہے جو اللہ اور رسول کے باغی ہیں۔ علم انہی کا پڑھتا ہے، فلسفہ انہی کا سیکھتا ہے، تہذیب میں، آداب میں، معاشرت میں تقلید انہی کی کرتا ہے، اپنا مال، اپنا وقت، اپنی قابلیت سب کچھ انہی پر نثار کرتا ہے اور جبراً نہیں بلکہ طوعاً کرتا ہے۔ صرف کرتا ہی نہیں بلکہ اس پر فخر بھی کرتا ہے اور صرف خود ہی نہیں اس فخر کو اپنے تک رکھنا چاہتا بلکہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کی آئندہ نسلیں بھی اس فخر میں سے حصہ پائیں۔ یہ خدا کو ماننے کا حق صرف اس طرح ادا کر دیتا ہے کہ مسجد میں اس کی نماز پڑھ دیتا ہے، اس کے نام پر کچھ زکوٰۃ دے دیتا ہے، مہینہ بھر کے روزے رکھ دیتا ہے، باقی اس کے سوا سارے معاملات زندگی میں وہ جس خدا کی بھی اطاعت کرے اس سے اس کے خدا کو کوئی واسطہ نہیں۔ رسول کے ماننے کا حق یہ صرف اسی طرح ادا کرتا ہے کہ نمازوں میں ان کی ذات پر درود بھیج دیتا ہے، سال میں عید میلاد کے جلسے کر دیتا ہے۔ اگر ان کی شان میں کوئی ادنیٰ گستاخی کسی سے صادر ہو جائے تو اخباروں میں اور جلسوں میں ہنگامے برپا کر دیتا ہے، باقی رہی یہ بات کہ زندگی کے تمام شعبوں میں وہی واجب الاطاعت اور انہی کا بنایا ہوا طریقہ واجب الاتباع ہے اور ان کے طریقے کے سوا سارے طریقے فسق اور کفر ہیں، یہ اس کے ایمان بالرسول میں داخل نہیں ہے۔ یہ آخرت کو مانتا ہے لیکن اس اطمینان قلب کے ساتھ مانتا ہے کہ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً جہنم کی آگ اسے چند دنوں سے زیادہ نہیں چھوئے گی۔ یہ جتنی نافرمانیاں چاہے کرے اور کتنے ہی ٹھنڈے دل سے چاہے کرے، یہاں تک کہ اگر ان نافرمانیوں ہی کو وہ اپنا اور اپنی آل و اولاد کا دین بنا لے اور اسی دین پر وہ اور اس کی نسلیں جئیں اور مریں جب بھی وہ نجات کا حقدار ہے۔ نجات اس کا پیدائشی اور قومی حق ہے۔ یہاں تک کہ کتنے مسلمان ہیں جو شاید اسلام کا نام بھی نہیں جانتے اور دین کے واجبات و فرائض میں سے شاید ایک فرض کو بھی کبھی ادا کرنے کی انہیں توفیق نہیں ہوئی تاہم وہ مسلمان ہیں —— ایک ایسی دنیا میں اگر آپ تقویٰ کی تعلیم دینا چاہیں تو اس کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

ایک طریقہ تو وہ ہے جو ہماری خانقاہوں نے اختیار کر رکھا ہے۔ اس طریقہ کی تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں مختصر

اس کی خصوصیات کو نمایاں کرنے کے لیے چند باتیں ہم یہاں عرض کریں گے۔ اس طریقہ کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ارباب خانقاہ اس بات کے قائل ہیں کہ چاہے وقت کا سیاسی نظام کچھ ہو، خدائی ہو یا شیطانی، آدمی اس کا دل و جان سے مطیع و فرمانبردار اور خدمت گذار رہ کر تقوی حاصل کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ ان کے سکھائے ہوئے طریقہ پر کچھ اعمال و وظائف کا پابند ہو جائے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ لوگ تقویٰ کا یہ مفہوم نہیں سمجھتے کہ آدمی زندگی کے تمام شعبوں میں حدود الٰہی کا پابند ہو بلکہ ان کے یہاں تقویٰ کچھ خاص اعمال ہیں اگر آدمی ان کا پابند ہے تو باقی امور میں اس کا جو حال بھی ہو اس سے اس کے تقوی میں کچھ فرق نہیں پیدا ہوتا۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ حضرات، تقویٰ کی تعلیم کے لیے عقل و استدلال کے راستہ کے قائل نہیں ہیں بلکہ توجہ اور صرف قلوب کے قائل ہیں۔ شیخ کا باطنی تصرف ان کے یہاں تقوی پیدا کرنے میں اصلی عامل ہے۔ چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ یہ حضرات تقویٰ پیدا کرنے کیلیے کتاب و سنت کے طریقہ کے پابند نہیں ہیں بلکہ ان کا زیادہ تر اعتماد اپنے اور اپنے ہم پیشہ حضرات کے تجربات پر ہے۔ جو کچھ انھوں نے سینہ بسینہ ورثہ میں پایا ہے یا جو بات ان کے دل میں خطور کر جائے اس کو تقوی پیدا کرنے کے لیے اصلی چیز سمجھتے ہیں۔ پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ ان کے تقوی میں مقدم و موخر کی ترتیب وہی نہیں ہے جو شریعت میں ہے۔ یہ لوگ بعض چیزوں کو بسا اوقات کوئی اہمیت نہیں دیتے جو دین میں نہایت بنیادی اور اصولی حیثیت رکھتی ہیں اور بعض دوسری چیزوں کو جو اصل دین میں بالکل ثانوی درجہ کی چیزیں ہیں اصل الاصول قرار دیتے ہیں۔ ہماری بہتر سے بہتر خانقاہ میں تقوی کی تعلیم انہی خصوصیات کے ساتھ جاری ہے۔ اسی پر ان خانقاہوں کو قیاس کر لیجیے جو عام طور پر ہر شہر میں پائی جاتی ہیں اور ہر قسم کی بدعات و لغویات کا مرکز ہیں۔

اس کے بالکل برعکس ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اصلی کارفرما طاقت وقت کا سیاسی نظام ہے جب تک اس کی اساس تقوی پر نہ ہو اس وقت تک لوگوں میں اولاً تو تقوی پیدا ہونا ناممکن ہے اور اگر کسی طرح پیدا ہو جائے تو اس کا قائم رکھنا ناممکن ہے۔ اس وجہ سے ہم سب سے پہلے اس نظام فکر سے پنجہ آزمائی کرنا ضروری سمجھتے ہیں جس پر وقت کا سیاسی نظام قائم ہے۔ اور اس کو توڑ پھوڑ کر ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور ایمان بالآخرت کی اساس پر قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کام کے لیے ہم نے عقل و استدلال کی راہ اختیار کی ہے اور اس ترتیب کے ساتھ جس پر اللہ کا دین اترا ہے دین کی حجت لوگوں پر قائم کر رہے ہیں۔ جن لوگوں پر توحید، معاد اور رسالت کے صحیح مقتضیات واضح ہوتے جاتے ہیں ان لوگوں کو ہم ایک نظام میں منسلک ہونے کی دعوت دے رہے ہیں تاکہ یہ سب مل کر اس اجتماعی تقوی کی طرف مارچ کریں جو اصلی تقویٰ ہے اور جس کے لیے جد و جہد کیے بغیر کوئی فرد اپنے تقوی میں کامل نہیں ہو سکتا۔ اس طریقہ میں مقدم وہی ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے مقدم کیا ہے اور موخر وہی ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے موخر کیا ہے۔ ہماری جد و جہد یہ ہے کہ وقت کی عقلیت پر اسلام کے عقائد اور اعمال کی برتری کا ہر پہلو سے اس طرح چھا جائے کہ لوگ اسلام کو وقت کی ساری بیماریوں کا علاج سمجھ کر اس کی طرف بڑھنے

لگیں اور تمام انسانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی اللہ تعالیٰ کے قائم کیے ہوئے حدود کے اندر بسر ہونے لگے۔ ہر شخص اللہ کو حاکم و بادشاہ مانے۔ ہر شخص اس کے رسول کے طریقہ کو نجات کا طریقہ سمجھے، ہر شخص اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے آگے جوابدہ یقین کرے۔ ہمارے نزدیک تقویٰ پیدا کرنے کا صحیح طریقہ یہی ہے۔ یہی طریقہ ہم نے حضرات انبیائے کرام کی زندگیوں سے سمجھا ہے۔ اور اپنی طاقت کے مطابق اسی پر چل رہے ہیں۔ جو لوگ ہمارے اس طریقہ کو انبیائے کرام کے طریقہ کے مطابق پائیں وہ ہمارے اس کام میں ہماری مدد کریں۔ باقی جو لوگ خانقاہی طریقہ کو طریق انبیاء کے موافق پاتے ہیں وہ اس کو اختیار کر سکتے ہیں۔

ایک ضروری گذارش

ہمارے ہاں جو شعبۂ استفسارات قائم ہے اس کا مقصد دراصل یہ ہے کہ جو لوگ تحریک اسلامی کو سمجھنے اور اس کے نصب العین اور طریق کار کے متعلق اپنے شبہات دور کرانے کے لیے مرکز سے خط و کتابت کریں، ان کے خطوط کے جوابات دیے جاتے رہیں، نیز اسلامی نظام حیات کے ان اہم اصولی مسائل کے متعلق لوگوں کو صحیح واقفیت بہم پہنچائی جائے جنھیں بالعموم غلط طریق سے سمجھا سمجھایا جاتا ہے۔ رہے چھوٹے چھوٹے فقہی مسائل تو ان میں سے صرف ایسے مسائل کا جواب یہاں سے دیا جا سکتا ہے جنھیں صحیح اسلامی نظریہ سے عام طور پر حل نہ کیا جا رہا ہو۔

لیکن قارئین ترجمان القرآن اور جماعت اسلامی کے متاثرین کی طرف سے جو خطوط روزانہ ڈاک میں موصول ہوتے ہیں ان کے مطالعہ سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید شعبۂ استفسارات کو کوئی "دارالافتا" سمجھ لیا گیا ہے۔ بس ایک تسلسل سے استفتے پر استفتے چلے آ رہے ہیں جن پر ادنیٰ سے ادنیٰ جزئیات پر سوال کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ مسائل مقامی علماء بلکہ معمولی ائمہ مساجد سے بھی حل کروائے جا سکتے ہیں۔ پھر بعض لوگوں کو سوال کرنے کا جنون ہو گیا ہے کہ ایک ایک خط میں بیس بیس اور تیس تیس سوالات لکھ بھیجتے ہیں، حالانکہ شریعت میں کثرتِ سوال کو ناپسند کیا گیا ہے کیونکہ یہ پریشان دماغی کی علامت ہے۔

بہرحال ہم اپنے ہر کرمفرما سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ استفسارات بھیجتے وقت حسب ذیل امور کا لحاظ رکھیں۔

(۱) سوالات لکھنے سے پہلے یہ بات ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ ہمارے یہاں کوئی اصطلاحی دارالافتا نہیں ہے۔

(۲) پوچھنے کے قابل صرف وہ سوالات ہوتے ہیں جو عملی زندگی میں یا دین حق کی دعوت و تبلیغ کے دوران میں واقعۃً پیش آئیں۔ تصنیف کردہ سوالات لکھ بھیجنا ایک فضول حرکت ہے۔

(۳) سرسری سوالات مقامی اہل علم سے، کسی دارالافتاء سے یا کسی علمی ادارے سے پوچھ لیجیے۔ اس کے بعد اگر کوئی اہم اور اصولی مسئلہ یا کوئی پیچیدہ فقہی جزئیہ حل طلب رہ جائے تو اس کا جواب اول تو جماعت کے لٹریچر اور ترجمان القرآن کے فائل سے دریافت کیجیے۔ لیکن اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو ہمیں لکھیے۔ ایسے ہی سوالات کا جواب دینے کے لیے شعبۂ استفسارات قائم کیا گیا ہے۔

(شعبۂ استفسارات)

حاصل ہوجاتی ہیں، وہی آگے بڑھا کرتی ہے۔ دماغی ترقی طبیعی قوتوں پر انسان کی دسترس بڑھاتی ہے اور ان قوتوں کی مدد سے جماعتیں انسانی آبادیوں کو مسخر کرتی ہیں۔ اس تسخیر اور نفاذ و استحکام اقتدار میں زیادہ سے زیادہ جو تیسری قوت استعمال ہوتی ہے وہ سیاسی ساحری کا فن ہے جس کے بغیر "قاہری" کوئی بڑا نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی۔ سو مغربی تصور کے مطابق اجتماعی قوت کے اقانیم ثلاثہ یہ ہوئے:-

(ا) علوم طبیعی (ب)- قدرتی وسائل (ج)- سیاسی ساحری کا فن

مگر یہ "قوت اجتماعی" کا نامکمل تصور ہے۔ علوم طبیعی کا نشوو ارتقا اور قدرتی وسائل سے استفادہ کی صلاحیتیں اور سیاسی حکمت تو افراد انسانی کے دفاعی کرشمے ہیں اور ان ہی کے اجتماع و تعاون سے اجتماعی قوت کا ظہور ہوتا ہے۔ اب سوچیے کہ یہ اجتماع و تعاون کیسے نمودار ہوتا ہے اور اس کا دائرہ کس طرح پھیلتا ہے؟

فرض کیجیے کہ آپ ایک دیس میں کھڑے ہو کر لوگوں کو یہ دعوت دیتے ہیں کہ آؤ اپنی اپنی صلاحیتوں اور استعدادوں کو ایک مرکز پر جمع کر دو۔ ماہرین علوم طبیعی اپنی اپنی تحقیقاتیں اور ایجادیں پیش کر دیں، علمائے سیاست اپنے اپنے "جادوؤں" کا مظاہرہ کریں، دولت و سرمایہ کے مالک اپنے مال ڈھیر کر دیں، مزدور اور دہقان اپنی محنت کی متاع بیش بہا لے کر حاضر ہو جائیں:—— کیا یہ آواز سنتے ہی دنیا تعمیل کرے گی؟ نہیں، ہرگز نہیں! وہ آپ سے دریافت کرے گی کہ ہم کاہے کو یہ دعوت مان لیں؟ چنانچہ آپ کو مقصد بتانا پڑے گا کہ آپ ایک اجتماعی ہیئت کی تشکیل کر کے سیاسی تمکن حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر آپ کا سیاسی تمکن فی نفسہٖ کسی کا مقصود نہیں ہو سکتا، آپ کو یہ بھی بتانا پڑے گا کہ اس تمکن کی غایت کیا ہے؟ چنانچہ آپ بتاتے ہیں کہ ہمارا مقصد نوع انسانی یا کسی ایک نسل و وطن کے فرزندوں کی فلاح و بہبود ہے۔ لیکن صرف اتنی توضیح بھی لوگوں کو آپ کے گرد جمع نہیں کر سکتی۔ آپ کو یہ بھی بتانا پڑے گا کہ فلاح و بہبود سے آپ کی مراد کیا ہے اور وہ کون سے اصولِ فکر و عمل ہیں جو جملہ بنی آدم یا آپ کی ہم نسل و ہم وطن برادری کی فلاح و بہبود کے ضامن ہو سکتے ہیں۔ ان سارے پہلوؤں سے اگر آپ خواص و عوام کی "رضا" حاصل کر سکے تو وہ اپنی ساری صلاحیتوں اور ساری مادی قوتوں کے ساتھ آپ کے گرد سمٹ آئیں گے۔ پس مادی قوتیں جماعتی نظام میں خارجی حیثیت رکھتی ہیں اور جماعت کی داخلی قوت وہ اصول و مقاصد ہیں جو انسانی رضا کو اپنی طرف جذب کرتے ہیں۔ پس جماعتی قوت کا شجرہ نسب مختصراً یہ قرار پائے گا:-

اصول (۱) و مقاصد ←—— انسانی آبادی (۲) کی رضا ←—— مادی قوت (۳) ←—— تمکن فی الارض (۴)

انسانی رضا حاصل کر سکنے والے اصول و مقاصد کو جماعت کی ہیئت سے الگ کر دیجیے تو پھر آپ کے پاس نہ مادی قوت فراہم ہو سکے گی اور نہ تمکن فی الارض کا کوئی امکان رہے گا، بلکہ خود "جماعت" نام کی کوئی چیز بھی باقی نہ رہے گی، صرف منتشر افراد ہوں گے جن کے پاس ہر طرح کی صلاحیتیں ہوں گی مگر وہ کسی کام نہ آ سکیں گی! پس اصول و مقاصد جماعتوں کے لیے اصل قوت ہیں جن سے انسانی رضا ظہور کرتی ہے۔

اصول و مقاصد کی جاذبیت آگے چلنے سے پہلے ہمیں اصول و مقاصد کی جاذبیت کا راز ڈھونڈنا ہے، کیونکہ اس کے محور پر ہماری ساری بحث کا پہیہ گھومتا ہے۔ تو اب غور فرمایئے کہ آپ ارد گرد کی دنیا کو اگر اس مقصد کی طرف بلائیں کہ لوگو اٹھو اور "زید" کی فلاح و بہبود میں اپنی ساری مساعی صرف کرنے کے لیے جماعت بندی کرو تو زید کے سوا شاید کوئی اور اس پر لبیک کہنے والا

حقیقیہ کے معدوم ہوتے چلے جانا اور امامتِ حکمیہ کا ابھرتے چلے آنا۔ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ سیاستِ ایمانی[1] میں ...... جتنا جتنا دخل سیاستِ سلطانی[2] کا بڑھتا جاتا ہے، اسی تناسب سے امامتِ حکمیہ غالب ہوتی چلی جاتی ہے۔

اس امر کو سمجھنے کے لیے سیاستِ ایمانی کو آبِ شیریں اور سیاستِ سلطانی کو آبِ شور فرض کر لو۔ ظاہر ہے کہ آبِ شور کی جتنی مقدار آبِ شیریں میں ملائی جائے گی، اسی قدر آبِ شیریں کی لطافت زائل ہوگی اور آبِ شور کی تلخی ابھرے گی، بالفاظِ دیگر دونوں پانیوں کی مقدار کے تناسب کے ساتھ ساتھ لطافت و تلخی کے مدارج بدلتے جائیں گے۔ بالکل اسی طرح سیاستِ ایمانی و سیاستِ سلطانی کی آمیزش مختلف تناسبوں اور مختلف درجوں کی ہو سکتی ہے اور اس کے تناسبوں اور درجوں کے بدلنے سے خلافتِ راشدہ کے مدارج میں فرق آ جائے گا۔ اسی معنی کی تفصیل کے لیے ہم آبِ شیریں اور آبِ شور کی آمیزش کو حسبِ ذیل چار موٹے موٹے درجوں میں رکھتے ہیں:

(۱) پہلی صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ صاف اور ٹھنڈے اور میٹھے پانی کی کثیر مقدار میں ایک ذرا سا کھاری پانی مل جائے۔ اس صورت میں ذائقہ میں کوئی خاص تلخی اور تیزی محسوس نہیں ہوگی، بس ذرا پانی کی نفاست و لطافت میں نقص آ جائے گا۔ ایسے پانی کو لطیف طبع اور نازک مزاج لوگ تو پسند نہ کریں گے، لیکن پیاسے اس سے سیراب ہو سکیں گے، نباتات کو اس سے نشو و نما ملے گی، ہر طرح کے کھانے اس سے پک سکیں گے اور مختلف اقسام کے پارچہ جات کی دھلائی اس سے ہو سکے گی۔ ان وجوہ سے یہ پانی حقیقتہً آبِ خالص نہ ہوتے ہوئے بھی آثار کے لحاظ سے آبِ خالص سے مشابہ اور فوائد کے لحاظ سے اس کی برابری کرتا ہے۔

(۲) دوسرے درجہ کی آمیزش ایسی ہوگی کہ پانی کے ذائقہ میں تیزی و تلخی خوب اچھی طرح نمایاں ہو اور ہر کس و ناکس کے لیے اس کا پینا ناگوار ہو، اسے چکھتے ہی کراہت ہونے لگے۔ ایسے پانی سے پیاس کی جلن کم ہونے کی جگہ اور زیادہ بھڑکے گی، اور دوسرے فوائد میں بھی فرق آئے گا۔ یعنی جو کھانا اس میں پکے گا، اسے کھاتے ہوئے قدرے تلخی محسوس ہوگی، کپڑے اس سے دھیں گے تو ان سے میل کچیل پوری طرح زائل نہ ہوگا۔ اسی طرح اس سے سیراب ہونے والے پودوں کی سرسبزی میں بھی نکھار نہ آئے گا۔

(۳) تیسرے درجہ کے مرکب میں میٹھے اور کھاری پانی کا تناسب ایسا ہوگا کہ کھاری پانی کی تلخی و حدت خوب زور سے نمایاں ہوگی اور مزہ اتنا بگڑ جائے گا کہ اس مرکب پانی کو بول چال میں آبِ شور ہی کہا جائے گا۔ اسے اگرچہ ضرورت پوری کرنے کے لیے استعمال کیا جائے گا، لیکن جس حد تک ممکن ہوگا، اس سے اجتناب بھی کریں گے، یعنی گھوڑے اور گدھے کو اس سے دھو لیں گے، گھر دھو لیا کریں گے اور پشمینہ کے لباس نہ دھوئیں گے۔ ادنیٰ درجہ کی نباتات مثلاً تمباکو وغیرہ کی فصل کو اس سے سیراب کر لیں گے مگر پھل پھول لانے والے نازک پودوں کی ایسے پانی سے پرورش نہ کی جائے گی۔

(۴) چوتھے درجہ کے مرکب میں میٹھے پانی کی مقدار اتنی کم اور کھاری پانی کی مقدار اتنی زیادہ ہوگی کہ شیرینی و لطافت

---

[1] یعنی خلافتِ راشدہ میں۔ [2] سیاستِ ایمانی کی ضد، یعنی ریاست کا نظم چلانے کے لیے خود ساختہ قوانین اور ... حکمتِ عملی کا استعمال کرنا ... ہو ...

کا کوئی شائبہ قطعاً اس میں محسوس نہ کیا جا سکے گا، یہاں تک کہ اس سے پانی کا کوئی فائدہ بھی حاصل نہ ہوگا اور اگر کوئی شخص مجبوری کی حالت میں اسے استعمال کرے گا بھی تو اس سے ہرگز حاجت پوری نہ ہوگی۔ مثلاً اگر وہ پیاس بجھانے کے لیے اسے پئے تو پیاس کی آگ دگنی بھڑکے گی، اگر درختوں کو یہ پانی دیا جائے گا تو وہ مرجھا کے رہ جائیں گے اور اگر اس میں کھانا پکایا جائے گا تو وہ ناپختہ اور بدمزہ رہے گا، بلکہ مضرِ صحت بھی! پھر کیسے ان باتوں کے ہوتے ہوئے اس مرکب پانی کو کسی درجہ میں بھی آبِ شیریں کہا جا سکتا ہے؟ —— اسے آبِ شیریں تو کیا کہیں گے، اس کی بڑی سے بڑی مقدار کے ہوتے ہوئے پانی کے ضرورت مندوں کو کہا جا سکتا ہے کہ یہاں پانی بالکل ہے ہی نہیں! دشتِ بے آب میں ایسے پانی سے اگر کسی مسافر کا کوزہ لبالب بھرا ہوا ہو تو بھی وہ اپنے آپ کو تشنگی کی موت مرنے سے نہیں بچا سکتا۔

اب تمثیلی اندازِ بیان کو چھوڑ کر ہم اصل مدعا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور امامتِ حکمیہ کے مختلف درجوں پر بحث شروع کرتے ہیں۔ سب سے پہلے یہ حقیقت سمجھ لینی چاہیے کہ اس خوفناک بیماری کی جڑ یا اس خاردار جھاڑی کا بیج فقط جذبۂ عبدیت کا زوال ہے۔[1]

خود "امامِ حقیقی" (خلیفۂ راشد) کی خاص حیثیت کی بنیاد جذبۂ عبودیت ہی ہوتا ہے، اور اسی جذبہ کے صدقے میں اس پر صفاتِ نبوت کا پرتو ڈالا جاتا ہے۔ اس کی ساری مساعی کا قبلۂ مقصود رضائے الٰہی ہوتا ہے جس کی طلب میں وہ اپنی ساری لذتوں کو قربان کر دیتا ہے۔ اس کی ساری چستیاں اور سرگرمیاں اپنے آقا و مولا کی خوشنودی کے لیے ہوتی ہیں اور وہ اپنے نفس کے تقاضوں سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ اتباعِ ہوا و ہوس کا اس کے ہاں کوئی سراغ نہیں ملتا۔ بس وہ حق و عدل کی راہ کو پوری استقامت سے طے کرتا ہے۔ اس کے قدم دوسری راہوں پر حرکت نہیں کر سکتے اور اس کی آنکھیں کسی دوسری منزلِ مقصود پر نہیں جم سکتیں۔ ماسوا اللہ کی ساری محبتوں کے جال توڑ کر وہ بارگاہِ حق تعالیٰ کی دہلیز پر ایسا بیٹھتا ہے کہ مر کر ہی اٹھتا ہے۔ اس کے بلند منصب کا احاطہ ان چند مقدس الفاظ سے ہو سکتا ہے:-

مَنْ احب للہ وابغض للہ واعطی للہ ومنع للہ فقد استکمل الایمان۔ — جس نے اللہ کے لیے محبت کی اور اللہ کے لیے عداوت کی اور اللہ کے لیے دیا اور اللہ کے لیے روکا تو اس نے ایمان کی تکمیل کر لی۔

یا ان الفاظ سے:-

مَنْ کَانَ اللہ ورسولہ احب الیہ مما سواھما — وہ جس کے لیے اللہ اور اس کا رسول محبوب ترین ہیں، اس سے جو کچھ ان کے سوا ہے

ایسی ہستی جب منصبِ خلافت پر متمکن ہوتی ہے تو سیاسی میدان میں اس کے مدنظر فقط خدا کے بندوں کی اصلاح کا کام ہوتا ہے اور نیابتِ رسول اللہ کا حق ادا کرنے کی فکر ہوتی ہے۔ اپنے ذاتی فائدوں کا لالچ اس کے دل کو رام نہیں کر سکتا ہے، نہ نقصانات کا اندیشہ اس کی ہمت توڑ سکتا ہے۔ اس کے نزدیک تو اطاعت زبانی کے ساتھ

---

[1] یعنی جب اربابِ حکومت میں خدا کی آقائی اور اس کے سامنے اپنی عاجزانہ غلامی کا احساس کمزور ہونے لگتا ہے تو خلافتِ الٰہی متغیر ہو کر امامتِ حکمیہ بننے لگتی ہے۔ (ن۔ص)

ہوائے نفسانی کا شریک ہو جانا شرک کا درجہ رکھتا ہے[۱] اور رضائے حق کے سوا کسی اور مقصود کی آرزو کو وہ دل کے لیے غلط تصور کرتا ہے۔ بندگانِ الٰہی کی صحیح تربیت کے سوا نہ ظاہراً اس کا کوئی اور مدعا ہوتا ہے، نہ اس کے دل کے گوشوں میں کوئی اور تمنا چھپی ہوئی ہوتی ہے؛ اس وجہ سے کوئی ایسی حرکت اس سے صادر نہیں ہوتی جو سیاستِ ایمانی سے انحراف کرنے اور سیاستِ سلطانی کی طرف جھک جانے کا ذریعہ بن جائے۔ صادر ہونا تو دور رہا، ایسی مکروہ حرکت کا خیال تک اس کے دل میں نہیں گذرتا۔ خلاصہ مطلب یہ کہ فریبِ نفس کی یہ مجال نہیں کہ اسے صراطِ مستقیم سے ہٹا سکے۔

بخلاف اس کے "امامِ حکمی" نہ نفس کے تقاضوں سے پوری طرح بے نیاز ہوتا ہے، نہ ماسوا اللہ کی گرفت سے آزاد ۔۔۔ چنانچہ مال و منال اور جاہ و جلال کی حرص، معاصرین پر تفوق کی اور اقوام و ممالک پر تسلط کی خواہش، عزیزوں دوستوں کی پاسداری اور مخالف دشمنوں کی بدخواہی، لذتِ جسمانی اور خواہشاتِ نفسانی کی غلامی، یہ سارے فتنے اس کے دل میں ابھرتے رہتے ہیں۔ بات دل ہی تک محدود نہیں رہتی بلکہ دل میں جو کچھ ہے وہ امڈ کے باہر آتا ہے اور اس کی حرکات سے نفس پرستی کا صاف صاف اظہار ہونے لگتا ہے۔ اپنے ان ذاتی مقاصد کے لیے امامِ حکمی سیاست کی مشین سے خوب مدد لیتا ہے اور نظامِ حکومت کو حکمتِ عملی سے کام لے کر اپنی نفسانیت کے ڈھب پر لے آتا ہے۔ اسی طرزِ سیاست کا نام ہے "سیاستِ سلطانی"؛ اگر ہم اس اصطلاح کی مجمل تعریف کرنا چاہیں تو اس کے لیے یہ الفاظ کافی ہوں گے:۔

> "سیاسی اختیارات کو ذاتی فوائد حاصل کرنے اور ذاتی تکالیف دور کرنے میں استعمال کا نام سیاستِ سلطانی ہے۔"[۲]

یہ ذاتی لذات کی ہوس جب سیاستِ ایمانی میں دخیل ہو جاتی ہے تو خلافتِ راشدہ کا زوال شروع ہو جاتا ہے

---

[۱] کس حقیقت نما انداز میں یہ بات کہی گئی ہے۔ کاش کہ اسے قارئین اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔ دین کی ساری منزلوں میں مسلمان کو اس کی فکر رہنی چاہیے کہ کہیں خدا کی حکومت کو، نظامِ جماعتِ اسلامی کو، یا دوسرے الٰہی ادارات کو چلاتے ہوئے وسیع یا محدود پیمانے پر جو نیابتی اقتدار اس کے سپرد کیا گیا ہے، اپنے شخصی و ذاتی انتفاع تو نہیں کر رہا۔ کہیں اس اقتدار کے بل پر کچھ آمدنی تو نہیں بڑھ رہی، کہیں دوسروں سے خدمت تو نہیں لی جا رہی، کہیں ہم چودھراہٹ کی نیت کا اعلان تو نہیں ہو رہا، وغیرہ۔ اگر ایسا ہے تو یہ خدا کی سب سے بڑی امانت یعنی نیابتی اقتدار میں خیانت ہے جس کے ڈانڈے شرک سے جا ملتے ہیں کیونکہ حکم و اقتدار کو خدا کیلیے خالص رکھنے کے بجائے جب اس میں اپنا حصہ بھی لگا لیا تو یہ گویا اس امر کا اعلان ہے کہ ہم بھی کچھ تھوڑے سے خدا ہیں۔

[۲] دنیا کو "دار الامان" اور "دار السلام" بننے میں اگر کوئی چیز حائل ہے تو وہ یہی ہے کہ انسان انسان سے مختلف قوتوں کے ذریعہ ناجائز فائدے اٹھانا چاہتا ہے اور ان قوتوں میں سب سے بڑی قوت غالباً حکومت ہی کی ہے۔ اس ادارے کی گرفت زندگی کے ایک ایک کونے اور گوشے کو محیط ہوتی ہے، پس اسی کو شخصی اور گروہی نفع اندوزی کا قوی تر ذریعہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ سیاستِ سلطانی کہ نظامِ سیاسی کی باگ ڈور جو عوام الناس کی سپرد کی گئی امانت رہی ہے بلکہ ان کو بھی اللہ کی طرف سے امانت کے طور پر ملی ہے، اسے ہاتھ میں لینے کے بعد کوئی شخص عوام الناس کے فائدے کے بجائے اپنی خواہشات کے ماتحت حرکت دے۔ یہ بندوں کی خدا وندی قصرِ حکومت میں نمودار ہو یا عدالت میں، دکان میں یا کارخانے میں، مدرسے میں یا ہسپتال میں، شدید نفرت کے قابل ہے ۔۔۔ سور کے گوشت اور شراب اور لواطت سے بھی زیادہ نفرت کے قابل۔ کیونکہ ایک خدا سے اگر سوئی کی نوک جتنا راستہ مل جائے تو پھر یہ اپنا راستہ خود بنا لیتی ہے، حتیٰ کہ سیل بنکر اسلام کے پورے نظامِ حق و عدل کو

اور سلطنتِ ظاہرہ ابھرنے لگتی ہے۔ مگر چونکہ یہ ہوس مختلف اشخاص میں کم وبیش ہوسکتی ہے، یعنی بعض اس کے زور کرنے سے دین وایمان کے دائرہ سے باہر نکل کھڑے ہوتے ہیں، بعض صرف فسق وفجور کی حد تک پہنچ کے رک جاتے ہیں، بعض پر اس سے کم اثر ہوتا ہے، صرف اتنا کہ آرام طلب بنجاتے ہیں۔ پس سیاستِ ربانی میں ہوا وہوس کی تیز کے حسب ذیل مختلف مراتب ہوسکتے ہیں:۔

مرتبۂ اول:۔ امام لذاتِ نفس سے مغلوب تو ہو مگر اس کے ساتھ ظاہرِ شریعت کا پابند بھی رہے، یعنی فسق وفجور اور ظلم وجور پر نہ اترآئے۔ اس کی آرام طلبی شریعت کے اوامر ونواہی سے ظاہراً کوئی تعرض نہ کرے بلکہ وہ صرف گنجائشوں اور رخصتوں کی تلاش میں رہے اور ان سے پورا پورا فائدہ اٹھائے۔ اس صورت کو "سلطنتِ عادلہ" کہا جائے گا۔

مرتبۂ دوم:۔ امام پر نفسانیت کا اتنا غلبہ ہو کہ وہ کبھی کبھی مطلب برآری کے لیے ظاہرِ شریعت کے حلقہ کو بھی پھاند جائے اور فاسقانہ بے باکیوں اور ظالمانہ دراز دستیوں کا مظاہرہ کر گذرے۔ مزید یہ کہ ان حرکات پر اس کی جبینِ عرقِ ندامت سے آلودہ نہ ہو اور دل توبہ کی طرف مائل نہ ہونے پائے۔ ایسے شخص کا نظامِ حکومت "سلطنتِ جابرہ" کہلائے گا۔

مرتبہ سوم:۔ امام پر نفس پرستیوں کا غلبہ اتنا بڑھ جائے کہ اسے فسق اور عیاشی میں یکتائے روزگار بنا کے چھوڑے وہ استکبار واستبداد کی جی کھول کر داد دے۔ دینِ حق اور سنتِ نبوی کے مقابلہ میں ظالمانہ اور جابرانہ قوانین گھڑ گھڑ کے لائے اور اپنے اس کرتوت کو ہنر وکمال سمجھ کر اس پر فخر کرے۔ ایسے حاکم کی حکومت کو ہم "سلطنتِ ضلالت" کا عنوان دیتے ہیں۔

مرتبہ چارم:۔ نفس پرست امیر خود ساختہ احکام وقوانین کو ضوابطِ شرعی پر ترجیح دے اور کتاب وسنت کی پیروی کا مضحکہ اڑائے، اس کی اہانت کرے اور اس پر طرح طرح کے اعتراضات اٹھائے۔ اپنے قوانین کے حق میں تو قصیدہ خوانی کرتا ہو لیکن شرعِ شریف کو محض لغویت اور بیہودہ گوئی قرار دے۔ اس کے نزدیک بادشاہ کائنات کے احکام اور نبی کریم کے ارشادات (نعوذ باللہ) مزخرفات سے زیادہ وزن نہ رکھتے ہوں جن سے اس کے زعم کے مطابق صرف جہلا اور احمق فریب کھاتے ہیں۔ ایسی امارت الحاد وزندقہ کی عمارت کھڑی کرتی ہے اور ہم اسے اصطلاحاً "سلطنتِ کفر" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

اب امامت حکمیہ کی ان چار قسموں کی تفصیل وتوضیح کی جاتی ہے۔

ا۔ سلطنت عادلہ

سلطانِ عادل سے ایک ایسا سیاسی امیر مراد ہے جو ترقئ جاہ وجلال اور زیادتِ عزّ واقبال کا طلبگار ہو، دوستوں آشناؤں میں ممتاز رہنا چاہے، شہروں اور علاقوں پر ذاتی تسلط رکھنے کا خواہشمند ہو، ملک فتح کرنے اور حکم چلانے کا تمنائی ہو، عوام وخواص کے درمیان اپنا تفوق قائم کرنے کا حریص ہو۔ پھر لشکر اور فوجیں جمع کرنے کا، خزانوں اور دفینوں کی کثرت کا اور اعزہ پروری اور دشمن کشی کا دلدادہ ہو۔ پھر اسے جسمانی لذات کی ایسی چاٹ

پڑی ہو کر پرشوکت محلوں اور دلربا چمن زاروں اور لذیذ کھانوں اور بھڑکیلے لباسوں اور تیز رو گھوڑوں اور چمکتے ہتھیاروں اور خوش رنگ پھلوں اور طرحدار معشوقوں اور سرود کے حلقوں اور شراب کی محفلوں اور بذلہ سنج رفیقوں کے پیچھے پڑا رہے۔ اس کی شدید خواہش یہ ہو کہ زندگی کا دامن کلفت و رنج کے داغوں سے پاک رہے اور فضا اس خواہش کی گود میں ہوا و ہوس کے گوناگوں فتنے پل پل کے جوان ہوتے رہیں۔ اس کے نزدیک فتنوں کی خدمت گذاری ثمرۂ سلطنت ہے اور ان کی خاطر وہ ہر گلی کی خاک چھاننے کے لیے پا بہ راہ کھڑا ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ ہوتا ہے ـــــ مگر ـــــ اس کے ساتھ ساتھ اور کسی نہ کسی طرح وہ ظاہر شریعت کا احترام بھی ملحوظ رکھتا ہے، اور انتہائی پریشان روی کے باوجود قوانینِ کتاب و سنت کے دائرہ کو پھاندنے کی جرأت نہیں کرتا۔ یہ اس وجہ سے کہ شریعت کی ظاہری پابندی تک کو ختم کرا دینے کے لیے نفسِ امارہ کا جتنا زور ضروری ہے وہ اس کے اندر پیدا نہیں ہوتا۔ اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ (۱) شریعت کی پابندی کے باوجود امامِ عادل کو نفس کے تقاضے پورے کرنے کا موقع کیسے ملتا ہے۔

نظام قانونی میں رکھنے | یہ بات تو واضح ہے کہ بہت سے ایسے مالی (Finnancial) اور انتظامی (Executive) معاملات امام کی رائے پر چھوڑے گئے ہیں جن پر شرع شریف نے تصریح سے حکم نہیں لگایا ہے۔ ایسے مسائل میں وقت کا امام جو فیصلہ دے گا اسی کو شریعت قرار دیا جائے گا۔ مثلاً انتظامی معاملات میں سے ایک معاملہ تعزیر کی مقدار متعین کرنے کا ہے، یعنی جن جرائم کے لیے شریعت نے قطعی حد مقرر نہیں کی ہے، ان کے لیے سزا تجویز کرنا امامِ وقت کا کام ہے۔ چنانچہ فرض کیجیے کہ ایک ہی جرم مختلف اشخاص سے صادر ہوتا ہے اور یہ سب امام کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔ اب یہ کچھ ضروری نہیں ہے کہ امام ان سب کے لیے ایک ہی سزا تجویز کرے، بلکہ وہ مختار ہے کہ کسی کو قید کر دے کسی کو تازیانہ لگائے۔ کسی کے لیے تحقیر و تذلیل کی کوئی شکل تجویز کرے، کسی سے عہدہ چھین لینے[1] کو مفید مطلب جانے اور کسی سے صرف بے رخی اور بے اعتنائی کا سلوک کرنے پر اکتفا کرے۔ یہ سب صورتیں جائز اور صحیح ہوں گی، یعنی ظاہر شریعت کے اعتبار سے اس طرح کے جائز فیصلے مسلمانوں کے لیے واجب التعمیل ہوں گے اور ان کی اطاعت سے گریز کرنا ایمان سے محروم کر دے گا۔ پھر اسی سلسلہ میں تفویضِ خدمات و مناصب کا معاملہ لیجیے، ادھر بھی امام کے اختیارِ تمیزی کو بہت کچھ دخل حاصل ہے۔ وہ کسی کو مرتبہ بلند پر پہنچاتا ہے اور کسی کو ادنیٰ مقام پر چھوڑ دیتا ہے[2]، ایک

---

[1] جس نظامِ عدلیہ کا مقصود بندوں کی اخلاقی اصلاح ہو وہ اپنے امراء اور حکام کو اختیارِ تمیزی کے استعمال کی گنجائش دے گا کیونکہ مختلف اشخاص کی اصلاح کے لیے مختلف مراتب و مدارج کی سزائیں کارگر ہو سکتی ہیں ـــــ ہاں وہ جرائم مستثنیٰ ہیں جن سے سوسائٹی میں کوئی بہت بڑا بگاڑ اور بہت بڑا فساد رونما ہوتا ہے، مثلاً قتل، چوری، زنا وغیرہ۔ [2] یہاں بھی وہی صورت ہے، یعنی اگر کسی نظام میں سلطنت کے کارکن "سندات" کی بنا پر چھانٹے جاتے ہوں، تو وہاں ہر قسم کا بے وقوف حکومت کی مشین میں نصب ہو سکتا ہے، جیسا کہ موجودہ نظام میں آپ کسی منصب پر اس شخص کو متمکن پاتے ہیں جو اس منصب کے لیے پوری طرح نااہل ہوتا ہے۔ آخر علمی قابلیت ہی دیکھنے کی چیز نہیں ہے آدمی کا تقویٰ، آدمی کی دیانت اور اس کا پورا کیرکٹر، اس کا ذوق، اس کا جبلی رجحان، اس کے خاندانی اور وراثتی تاثرات، یہ سب کچھ قابلِ لحاظ ہوتا ہے اور یہ چیزیں کبھی بھی سند سے نہیں تولی جا سکتیں۔ اسی وجہ سے شریعتِ اسلام صاحبِ امر کو اختیارِ تمیزی دیتی ہے۔ (ن ـ ص)

ایک کو اپنے پہلو میں جگہ دیتا ہے اور دوسرے کو اپنے سے دور رکھتا ہے، کوئی اس کے اشارہ سے افسروں کا افسر ہو کے رہ جاتا ہے اور کوئی ادنیٰ درجہ کے چوبداروں اور چپراسیوں کے حلقہ سے آگے نہیں نکل سکتا۔ ان مختلف صورتوں میں قانون شریعت کی طرف سے امام پر کوئی حرف نہیں آتا، بلکہ الٹا جو شخص ایسے معاملات میں امام پر اعتراض کرتا اور اسے برا بھلا کہتا ہے، وہ عاصی و باغی اور مردود و مطرود قرار پائے گا۔

پھر ایسا ہی معاملہ قتل سیاسی کا ہے، یعنی جرائم کی بعض ایسی قسمیں ہیں کہ ان میں سے اگر کوئی جرم کسی شخص سے صادر ہو تو اگرچہ شرعاً وہ مجرم کے قتل کو مقتضی نہیں ہے، لیکن اگر امام کی رائے اس کے قتل کا فیصلہ دے دے تو یہ قتل بالکل جائز ہوگا۔ ایسے ہی جنگ و صلح کے مسائل و معاملات ہیں[1] کہ امام بعض اوقات جابر و سرکش کفار کی سرکوبی میں تساہل سے کام لیتا ہے اور کبھی مومن و مسلم باغیوں اور مجرموں کے خلاف یکدم برسرپیکار ہو جاتا ہے۔ ان حدود میں امام اپنے اختیارات کو جیسے چاہے استعمال کرے، کسی کو اس سے قیل و قال کی مجال نہیں ہوگی۔

اب رہے وہ شرعی معالات جو مالیات سے متعلق ہیں،[2] وہ بڑی لمبی چوڑی بحث کے محتاج ہیں، مگر یہاں خلاصۃً یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اموال غنیمت کے سوا بیت المال کے دوسرے اموال کی تقسیم میں تمام مسلمانوں سے مساوات کا سلوک کرنا امام پر واجب نہیں ہے۔ وہ چاہے تو کسی کو ہزار ہا روپے یک مشت عطا کر سکتا ہے اور کسی دوسرے کو چاہے تو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ دے۔ اس پر بھی محروم کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کوئی چون و چرا کرے۔ اگر وہ چون و چرا کرتا ہے اور اعتراض اٹھاتا ہے اور اطاعت امیر کے دائرہ سے قدم باہر نکالتا ہے تو وہ بارگاہ حق میں نامقبول اور قرب الٰہی سے محروم ٹھہرتا ہے۔ بہرحال اس نوعیت کے معاملات و مساعی جو امام وقت کی رائے پر چھوڑے گئے ہیں، بے شمار ہیں، ان میں نمونہ کے طور پر بعض کا ذکر کر دیا گیا ہے اور بقیہ مثالوں میں سے بیشتر کا تذکرہ آئندہ ابواب میں دلائل و شواہد کے ساتھ آئے گا۔ انشاء اللہ۔

یہاں مدعائے بیان صرف یہ ہے کہ ان اختیاری معاملات میں خلیفۂ راشد بھی حکم لگاتا ہے اور سلطان عادل بھی، لیکن دونوں میں فرق ہوتا ہے۔ خلیفۂ راشد کے تصرفات کا مقصود احکام الٰہی کی اطاعت، دنیا کی اصلاح اور نوع انسانی کی صحیح تربیت ہوتا ہے۔ یعنی جتنے گوناگوں معاملات، بوقلموں مقدمات اور رنگا رنگ احکام اس کی طرف سے صادر ہوتے ہیں

---

[1] یہاں بھی امام کے وسیع اختیارات تیزی کا تذکرہ ہے اور یہاں بھی ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ نفاذ عدل اور تقسیم مناصب کے مسائل کے مقابلہ میں امور سیاسیہ و مسائل صلح و جنگ کے لیے کوئی مستقل حکم متعین کرنا اور بھی زیادہ مشکل ہے۔ کیونکہ ان امور کے متعلق کوئی حکم لگاتے ہوئے بدلنے والے حالات کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ پس ان مسائل میں بھی امام کو اپنی بصیرت سے کام لینے کے لیے جائز حد تک گنجائش دی گئی ہے۔ (ن۔ص) [2] بیت المال کے صرف میں بھی بڑی حد تک امیرالمومنین کو اپنی حکیمانہ نظر سے کام لینے کا حق حاصل ہے۔ کیونکہ یہ باتیں ہمیشہ کے لیے طے نہیں کی جا سکتیں کہ کیسے شخص کو کیسے حالات میں کتنا دینا اس شخص کیلئے اور سوسائٹی کے لیے مفید ہے۔ یہ صحیح ہے کہ خلیفہ کی وسعت اختیار مضر بھی ہو سکتی ہے مگر جہاں یہ نہیں ہوتی وہاں نظام "مشینی" اور "دفتری" ہوتا ہے، "انسانی" نہیں ہوتا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مشینی اور دفتری نظاموں کے تحت سوسائٹی کی ظاہری ٹیپ ٹاپ کتنی ہی جاذب نظر ہو انسان کو حقیقی امن اور مسرت نہ حاصل ہو گی۔

وہ صرف مفادِ ملت اور انتظامِ امت کے لیے ہوتے ہیں۔ وہ کسی پر نگاہِ کرم سے متوجہ ہوتا ہے تو دوستی اور قرابت کی پاسداری سے نہیں ہوتا، اسی طرح اگر کسی کی تذلیل کرتا ہے تو کسی ذاتی مخالفت و عداوت کے ماتحت انتقاماً نہیں کرتا، بلکہ جس امر کو نظامِ امت اور مفادِ ملت کے لیے مناسب سمجھتا ہے صرف اس کو اختیار کرتا ہے، اور دل وجان سے اختیار کرتا ہے وہ جس شخص کو کسی خدمت کے لیے موزوں سمجھے گا ضرور اسی کو وہ خدمت سونپے گا، چاہے وہ اس کا دلی دوست ہو یا جانی دشمن :—— بخلاف اس کے سلطانِ عادل کا معاملہ دوسرا ہے، یعنی اگرچہ وہ احکامِ دین اور آثارِ سنت میں کوئی مداخلت نہیں کرتا، بلکہ صرف مذکورہ بالا اختیاری امور ہی میں تصرف کرتا ہے، لیکن اس تصرف کی مختلف صورتوں میں وہ اپنے نفس کے تقاضوں کی رعایت ضرور کرتا ہے۔ مثلاً دو آدمیوں سے ایک ہی جرم سرزد ہوتا ہے، ایسا جرم جس کے لیے حدِ شرعی متعین نہیں ہے، بلکہ اس پر امام کو تعزیر اپنی رائے سے قائم کرنی ہے۔ اب یہ ممکن ہے کہ ایک کے لیے قید و تازیانہ کی سزا نافذ ہو جائے اور دوسرے کے لیے صرف نگاہِ لطف کا پھیر لینا مناسب قرار پائے۔ اس امتیازی رویّہ میں خلیفہ راشد تو یہ ملحوظ رکھے گا کہ مجرموں کی اصلاح کس طرح ہو سکتی ہے، اب جس کے متعلق اسے یقین ہو جائے گا کہ یہ قید و تازیانہ کے بغیر راہِ راست پر نہیں آسکتا، اس پر سخت تعزیر عائد کرے گا اور جس کے متعلق وہ یہ اندازہ کرے گا کہ یہ صرف اظہارِ تغافل سے درست ہو سکتا ہے اور اگر اس کی زیادہ تذلیل کی گئی تو حمیتِ جاہلیہ اس کے اندر اس حد تک ابھرے گی کہ خود کشی کی نوبت آسکتی ہے تو اس کے لیے ہلکی سزا مقرر کرے گا۔ مگر سلطانِ عادل ایسے موقع پر جو فیصلہ دے گا ان میں نفسانیت بھی سرایت کر سکے گی۔ مثلاً اس کے سامنے ایک مجرم آتا ہے جس کے خلاف اس کے دل میں پہلے سے کینہ بھرا ہوا ہے، مگر شرعاً کسی جرم کے اثبات کے بغیر سلطان بے بس تھا اور انتقام کی آگ نہ بجھا سکا مگر اب جرم ثابت ہوتے ہی نفس کا تقاضا پورا کرنے کے لیے ادھر حالات سازگار ہوئے اور ادھر وہ مجرم پر جھپٹ پڑا اور کسی سخت سزا کا حکم دے دیا۔[1]

سطورِ بالا میں خلافتِ راشدہ اور سلطنتِ عادلہ کا نازک فرق ضروری حد تک بیان کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اگرچہ سلطنتِ عادلہ[2] کے نظام سے بظاہر شرع شریف کو فائدہ پہنچتا ہے مگر درحقیقت یہ نظام اس کے لیے مضر ہے۔ اکابرِ امت کو خصوصیت کے ساتھ اس سے ضرر پہنچتا ہے اور تزکیۂ نفس، حسنِ خلق، اخلاصِ عمل، خیر خواہی خلق اللہ اور تربیتِ عباد اللہ میں سیرتِ پیغمبر اور سنتِ رسول کو جو دخل ہوتا ہے وہ دھیرے دھیرے ختم ہونے لگتا ہے اور علماء و زعمائے امت جو فضائلِ دینی کے لحاظ سے واجب التعظیم ہوتے ہیں، ان کا کوئی وقر نہیں رہتا! کیونکہ سلطنتِ عادلہ کے

[1] ایسے مفاسد کی روک تھام کے لیے دنیا کا کوئی قانونی نظام کامیاب تدابیر نہیں اختیار کر سکا ہے، مگر اسلام نے تو انسانی زندگی کو اخلاقیت کی اساس پر کھڑا کر کے بڑی حد تک رخنہ بندی کر دی ہے۔ اب اگر کوئی اِکا دُکا قانون پرست اس کی سوسائٹی میں ابھرتا ہے تو اس کا کیا علاج ؟—— یہ ہو سکتا ہے کہ کچھ اجتہادی تدابیر نظامِ حکومت اور نظامِ عدالت کے خارجی ڈھانچہ کی تعمیر میں ایسی اختیار کی جائیں جن سے ایسے مفاسد کا ظہور اور بھی بعید از امکان ہو جائے۔ (ن-ص) [2] ذرا غور کیجیے کہ "سلطنتِ عادلہ" جو خلافتِ راشدہ سے ایک ہی درجہ فروتر ہوتی ہے وہ تک شریعت کے لیے مضر اور اصلاح و تربیتِ انسانی میں غیر سود مند ہے —— مگر کجا یہ حال کہ خالص طاغوت کی حکومت، شیطان کی سیاست، فرعون اور نمرود کا اقتدار مسلمانوں کے ہاں سے سندِ جواز حاصل کر لیتا ہے۔ (ن-ص)

دور میں بڑے سے بڑے تیس مار خانوں کا دینی کارنامہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ چند مسائل فقہ کو رٹ لیں[1] اور انہیں ڈھال بنا کر سلطان وقت کے گزند سے محفوظ رہیں یا اگر ضرورت پڑے تو کسی دشمن کو اپنے علم فقہ کے زور سے عدالت کے سامنے مجرم ثابت کر دکھائیں۔ یہ چیزیں روح شریعت کو بری طرح مجروح کر دیتی ہیں، درانحالیکہ اس کا نظر فریب ڈھانچہ جوں کا توں کھڑا نظر آتا ہے۔ اسی وجہ سے ایسے نظام کو حدیث میں "ملک عضوض" (سلطنت مستبد) کی اصطلاح سے موسوم کیا گیا ہے۔ مثلاً خلافت راشدہ کے بعد نمودار ہونے والے نظام کی طرف حسب ذیل اشارہ ملاحظہ ہو:۔

هذا الامر بدء نبوة ورحمة ثم يكون خلافة ورحمة. ثم يكون ملكا عضوضا

یہ نظام نبوت ورحمت کی صورت میں شروع ہوا، پھر خلافت ورحمت کی شکل اختیار کرے گا، پھر مستبد بادشاہی بنے گا۔

اس موقع پر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ سلطنت عادلہ اعلیٰ اور ادنیٰ دو قسم کی ہوتی ہے۔ اس تقسیم کا راز یہ ہے کہ ظاہر شرع کی پاسداری جو سلطنت عادلہ کی لازمی علامت ہے، دو وجوہ سے برقرار رہتی ہے، یعنی یا تو خوف خدا اس کا سبب ہوتا ہے یا پاس مخلوق! پس اگر خوف خدا والی صورت ہو تو سلطنت عادلہ اعلیٰ ہوگی اور اگر بندوں کے خوف کی صورت ہو تو ادنیٰ۔

سلطنت کاملہ اعلیٰ قسم کی سلطنت عادلہ میں سلطان شریعت کی پاسداری ایمان کی وجہ سے کرتا ہے کہ اس کے نزدیک خدا تعالیٰ بادشاہ مطلق اور مالک برحق ہے اور وہ ناتوانوں، عاجزوں کا سہارا اور کثیر و قلیل پر قادر اور اعلیٰ و ادنیٰ پر غالب ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس کے پنجۂ قدرت میں بے بس محسوس کرتا ہے۔ اس صداقت پر بھی اسے یقین ہوتا ہے کہ ایک دن رب الارباب کی بارگاہ میں محکمۂ احتساب کے سامنے پیش ہونا ہے اور وہاں سے ہر گستاخی و شوخ چشمی کا پورا پورا بدلہ ملنا ہے، نیز یہ کہ اس بارگاہ میں بادشاہ مقتدر اور مسکین بے بس یکساں مسئول ہوں گے اور انصاف سب پر یکساں نافذ ہوگا۔ پھر وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ وہاں چل کر جبر و کبر، ظلم و جور، فسق و فجور وبال جان ہو جائیں گے اور ان کا مرتکب لعنت و عذاب کا مستحق ہوگا۔ وہاں ستم توڑنے والے آگ کے شکنجے میں کسے جائیں گے اور خود پسند سرکشوں کو ذلت کا طوق پہنایا جائے گا۔

اس حالت میں اگرچہ سلطان کو نفس امارہ گمراہی کی طرف کھینچتا ہے، مگر دوسری طرف سے خوف خدا اسے بے مہار نہیں بننے دیتا۔ چنانچہ اگر بہ تقاضائے بشریت وہ راہ حق سے ذرا ادھر ادھر ہو بھی جاتا ہے تو یہی خوف خدا گھسیٹ کر اسے پھر راہ راست پر لے آتا ہے۔ پس وہ لذات نفسانی کو پورا کرنے کے لیے شریعت کی دی ہوئی رخصتوں اور گنجائشوں کی حد تک ہی ترکتازیاں دکھاتا ہے۔ مثلاً اس کی چشم حسد لاکھ مطالبہ کرے کہ فلاں عاجز پر دست تعدی دراز

---

[1] کیا بصیرت افروز بات کہی ہے! سبحان اللہ! لیکن "مسائل فقہ کی رٹائی" آغاز انحطاط میں اتنی کہاں ہوگی، جتنی آجکل ہے۔ آج تقدس خانی کا کمال یہ ہے کہ صرف پائجاموں اور داڑھیوں کے طول ناپنے کا فن رٹتے رٹتے عمریں گذار دیتے ہیں اور اس کے ذریعہ اپنے تقدس کی دھاک بٹھاتے ہیں اور پھر اس تقدس سے امامت و امارت اور خطابت و صدارت اور کچھ نہ کچھ "آب و نان" بھی حاصل کرتے پھرتے ہیں۔ (ن۔ ص)

کرنا چاہے۔ لیکن وہ اس عاجز کے متعینہ شرعی حقوق کی پاسداری میں طوعاً و کرہاً اپنے پنجۂ اقتدار کو سمیٹے رہتا ہے، تاوقتیکہ اس پر شرعاً کوئی جرم ثابت نہ ہو جائے۔ جرم اگر ثابت ہو گیا تو اس کا کینۂ دیرینہ کھولے گا اور اس کے فیصلہ کو متاثر کریگا۔ اسی طرح کسی حسینۂ دلربا کے اشتیاق میں اسکا دل کتنا ہی پیچ و تاب کیوں نہ کھائے اور شوق وصال اسے کتنا ہی بے حال کیوں نہ کردے۔ لیکن تاوقتیکہ نکاح منعقد نہ ہو جائے، وہ جام وصال کو ہونٹوں سے نہ لگائے گا۔ ہاں نکاح کی سعی میں ضرور اپنے قیمتی اوقات اور اپنے بیش بہا اموال صرف کر کے سرگرداں رہے گا۔

اسی طرح اس کا نفس اگرچہ بزور یہ مطالبہ کرے گا کہ مطلب براری کے لیے ارباب کبر و جفا کے ہتھکنڈے استعمال کرنے چاہئیں، لیکن وہ حدیث الکبریاء ردائی والعظمۃ ازاری (یعنی خدا نبی کے ذریعے سے فرماتا ہے کہ کبریائی میری چادر ہے اور عظمت میری تہ بند ہے) کو مدنظر رکھتے ہوئے اس مطالبہ کو لو کر دے گا اور اپنے آپ کو نشست و برخاست اور رفتار و گفتار میں صرف اتنے ہی امتیاز کا مستحق سمجھے گا جتنے امتیاز کے لیے شرعاً اجازت ثابت ہو۔ اس کو یہ کبھی گوارا نہیں ہو گا کہ قیصروں اور کسراؤں اور دوسرے جبابرہ کے طور طریقے جو شرعاً حرام ہیں، اختیار کرے۔

ان امور کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا بجا ہو گا کہ اگرچہ سلطانِ عادل کی زندگی پر سیرتِ انبیاء و خلفاء کی قبا درست نہیں بیٹھتی، مگر پھر بھی شریعت کے قانونی نظام کی طرف سے اس پر کوئی الزام وارد نہ ہو گا۔ دراصل اس کے دل میں ایمان کا شعلہ ضرور بھڑک رہا ہوتا ہے مگر ہوا و ہوس کا دھواں اس کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے۔ اس کی روح میں یقین کی بجلی ضرور چمکتی ہے لیکن فساد نیت کی تاریکیاں اسے ڈھانپ لیتی ہیں۔ ملاحظہ ہو حذیفہؓ کی روایت:۔

قال:۔ قلت یا رسول اللہ! ھل بعد ھذا الخیر من الشر؟ قال نعم! قلت وھل بعد ذلک الشر من الخیر؟ قال نعم، وفیہ دخن! قلت وما دخنہ؟ قال یستنون بغیر سنتی ویھدون بغیر ھدی!

حذیفہ کہتے ہیں کہ میں نے سوال کیا یا رسول اللہ! کیا اس "خیر" کے بعد کوئی "شر" ہو گا؟ فرمایا ہاں! پھر میں نے پوچھا کیا اس "شر" کے بعد کوئی "خیر" ہو گا؟ فرمایا ہاں اور اس کے ساتھ تیرگی ہو گی۔ میں نے پوچھا کہ اس کی تیرگی کیا ہو گی؟ فرمایا کہ (امراء و سلاطین) میری سنت سے ہٹ کر چلیں گے اور میری ہدایت سے ہٹ کر قیادت کریں گے۔

اس روایت میں اولی الذکر "خیر" سے مراد نبوت اور خلافت راشدہ کا دورِ رحمت ہے، ثانی الذکر "خیر" اشارہ ہے سلطنت عادلہ کے قیام کی طرف اور لفظ "دخن" اور اس کے بعد کا توضیحی جملہ یہ واضح کرتا ہے کہ جس دور کی خبر دی جا رہی ہے وہ نظام سلطنت کا دور ہو گا، نہ کہ خلافت راشدہ کا! یہ خاص طرز کا نظام حکومت جس میں خوف خدا کی وجہ سے ظاہر شرع کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ ہماری اصطلاح میں "سلطنت کاملہ" ہے۔

سلطنت ناقصہ

اب لیجیے دوسرا پہلو، یعنی سلطانِ عادل کے دل میں خوف خدا اس حد تک پہنچا ہوا نہیں ہوتا کہ اس کے نفس امارہ کا راستہ روک سکے لیکن بندوں کی شرم اس کا دامن پکڑ لیتی ہے اور نفسانیت کے زور میں اسے احاطۂ شریعت سے باہر نکلنے نہیں دیتی۔ خود اس شرم کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں، مثلاً کبھی تو اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ جس ملک میں سلطنت عادلہ قائم ہوتی ہے اس کے خواص و اکابر دیندار اور مطیع شریعت ہوتے ہیں، یا کم از کم عادۃً

لوگوں کے اندر اتباعِ شریعت برقرار رہتا ہے اور ہر کس و ناکس اور مومن و منافق دین کے بندھن میں کسا رہتا ہے۔ ایسے حالات میں سلطان خوب سمجھتا ہے کہ اگر ظاہر شریعت کی مخالفت کرے گا تو جمہور میں بدنام ہوگا، جس کے نتیجہ میں عین ممکن ہے کہ اس کے خلاف شورش برپا ہو جائے۔ پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سلطان کے لیے اس کے پیش رو "سلاطین کامل" اتباعِ شریعت کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ وہ اگر اس کے آباؤ اجداد تھے تو وہ اچھی طرح محسوس کرتا ہے کہ ان کا خلف الرشید اور جائز جانشین قرار پانے کے لیے انہی کے دستور پر چلنا ہوگا ورنہ وہ ان کا ناخلف سمجھا جائے گا۔ لیکن اگر سلطان ان کی نسل سے نہ ہو تو بھی وہ یہ کوشش کرے گا کہ ان کے برابر بلکہ ان سے کچھ زیادہ نیک نامی حاصل کرے، پھر کہیں یہ صورت پائی جاتی ہے کہ سلطان عادل کا دور خلافتِ راشدہ کے دور سے بالکل متصل ہوتا ہے، اس وجہ سے اسے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر اس کی روش سیرت خلفائے راشدین کے بالکل خلاف ہوگی تو چھوٹے بڑے سبھی اس سے نفرت کریں گے اور اپنی زمام اختیار اس کے قبضہ میں نہ رہنے دیں گے، پس وہ شریعت کی نمائشی پاسداری کرتا ہے اور اس کی حدود کو کھلم کھلا نہیں پھاندجاتا۔

مگر ان ساری صورتوں میں پہچاننے والے جان جاتے ہیں کہ حقیقت کیا ہے کیونکہ اہل صدق و اخلاص اور ارباب تصنع و تکلف کے اعمال میں بہت فرق ہوتا ہے۔ معمولی فراست رکھنے والا بھی یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس شخص کا کردار ایک کھوکھلا قالب ہے، جس میں مطلقاً جان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سلطان عادل کی دیانت اور اس کا تشرع سچے مسلمانوں کے نزدیک ایک لحاظ سے مرغوب ہوتا ہے اور ایک لحاظ سے نامرغوب! مرغوب اس لحاظ سے کہ اس کا ڈھانچہ شریعت کے مطابق ہے! اور نامرغوب اس وجہ سے کہ اس دیانت و تشرع کا ظہور ایک مکار و ریاکار شخص سے ہو رہا ہے۔ اس کے افعال ایک مومن مخلص کی نگاہ میں بیک وقت معروف کی تعریف میں بھی آتے ہیں اور منکر کی تعریف میں بھی۔ یہ صورت ذیل کے فرمودۂ نبوت کے عین مطابق ہے:

یکون علیکم امراء تعرفون وتنکرون — تم پر ایسے امیر ہوں گے جو معروف و منکر دونوں پر چلیں گے۔

سلطنتِ عادلہ کی یہ شکل جس میں خوفِ خدا کی جگہ بندوں کا پاس سلطان کو ظاہر شریعت کا پابند رکھتا ہے، ہماری اصطلاح میں سلطنت ناقصہ کہلاتا ہے۔

چند اہم اشارات ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر گذشتہ بحث (سلطنت کاملہ) سے تعلق رکھنے والے چند اہم نکات کا تذکرہ کر دیا جائے۔

لہ یہ درست ہے کہ احترام قانون کے ہوتے ہوئے جو اخلاقی زوال کسی شخص کی سیرت میں آجاتا ہے، اسے قانون کے کانٹے پر تولا نہیں جا سکتا اور نہ اس پر کوئی سزا نافذ ہو سکتی ہے۔ مگر یہ زوال بالکل غیر محسوس بھی نہیں ہوتا۔ عقل عامہ تھوڑے سے غور کے بعد معلوم کر سکتی ہے کہ کسی شخص کی حرکات میں اخلاقی جان ہے یا نہیں۔ چنانچہ قانون سے فائدہ اٹھانے والے قانونی "امیر" سے اصحاب شوریٰ قدم قدم پر تصریح طلب کر سکتے ہیں، پریس اس پر تنقید کرے گا، اور محراب و منبر سے اس کی تذکیر کی جائے گی اور اس طرح کے مستقل دباؤ سے اس کی اصلاح کا امکان بھی ہوگا اور رعایا کی سیاسی تربیت بھی ہوتی رہے گی۔ (ن، ص)

اشارہ (۱)۔ سلطان کامل حکماً خلیفۂ راشد ہے!

مدعا یہ ہے کہ اگرچہ درحقیقت وہ خلافتِ راشدہ کے منصب سے محروم ہے، لیکن چونکہ اس کے نظم میں خلافتِ راشدہ کا ایک اعلیٰ ترین وصف موجود ہوتا ہے، یعنی ظاہرِ شرع کی خدمت جسے صدق و اخلاص کے ساتھ سلطان سرانجام دیتا ہے، اس لیے اگر اس کے معاصرین میں کوئی ایسا امام[1] موجود ہو جو خلافت راشدہ کا نظم چلانے کی لیاقت رکھتا ہو تو اس کے لیے بھی مناسب یہی ہے کہ وہ اپنی غیر سیاسی امامت پر قانع رہے اور اپنی ساری کوششیں ہدایت کو پھیلانے میں صرف کر دے۔ وہ میدانِ سیاست میں سلطان کامل سے دست و گریباں نہ ہو اور رعیت و سپاہ کو جنگ و جدال کے لیے اکسا کر خستہ حال نہ کر دے۔ یہ صحیح ہے کہ اس طرح خلافتِ راشدہ کا عالی قدر منصب اس کے ہاتھ سے جاتا ہے، لیکن بندگانِ خدا کی خیر خواہی میں بطور رضا بہ قضا اسے یہ نقصان گوارا کرنا چاہیے اور اپنے اس صبر کو جمہور مسلمین کے لیے ویسی ہی قربانی قرار دینا چاہیے جیسی حضرت حسن مجتبیٰؓ نے دی تھی کہ آپ نے سلطان شام کی مزاحمت سے اپنے آپ کو روک لیا۔ اسی قربانی کے پیش نظر حضرت موصوف کے لیے رسول مقبول کی زبان سے پیشگی کلمات ستائش وارد ہوئے تھے کہ:۔

ان ابنی هذا سید لعل الله ان یصلح به فئتین عظیمتین من المسلمین — میرا یہ بچہ سردار ہوگا، بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے۔

اس حدیث سے یہ بات بھی کھل گئی کہ خدا اور رسول کے نزدیک سلطان کامل کے حق میں "اجتماعِ کلمہ"[2] پسندیدہ ہے اور اس کی اطاعت بارگاہ حق تعالیٰ میں مقبول ہے۔

اشارہ (۲) سلطان کامل خلفائے راشدین اور عام سلاطین کے درمیان برزخ ہے۔

یعنی اگر بادشاہوں کے حالات کو دیکھا جائے تو ان کے مقابلہ میں سلطان کامل خلیفۂ راشد قرار پاتا ہے۔ لیکن خلفائے راشدین کی طرف نظر کی جائے تو وہ ان کے مقابلہ میں محض ایک بادشاہ سمجھا جائے گا۔ چنانچہ سلطان شام نے خوب کہا تھا کہ:۔

لست فیکم مثل ابی بکر و عمر ولکن سترون امراء بعدی — میں تمہارے اندر ابی بکر و عمر کی طرح نہیں۔ مگر امراء کو تم میرے بعد دیکھو گے۔

بہرحال سلطان کامل کا دورِ اقتدار چونکہ دورِ نبوت اور دورِ خلافت راشدہ کے ساتھ ایک گونہ مماثلت رکھتا ہے اس وجہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آغازِ دورِ نبوت سے لے کر سلطنت کاملہ کے اختتام تک ترقی اسلام کا زمانہ ہے۔ اس مدعا کو یہ حدیث موکد کرتی ہے:۔

تدور رحی الاسلام بخمس وثلاثین او ست وثلاثین او سبع وثلاثین فان یهلکوا — اسلام کی چکی چلتی رہے گی ۳۵، ۳۶ یا ۳۷ سال تک، پس اگر ہلاک ہو گئے تو ان لوگوں کے طریقہ پر ہلاک ہوں گے جو ہلاک ہو گئے اور اگر ان کا

---

[1] امام کی اصطلاح بہت وسیع الاستعمال ہے یعنی "مقتدر سیاسی امامت" کی طرف بھی اس کا اشارہ ہو سکتا ہے اور غیر سیاسی مذہبی امامت کی طرف بھی، جیسا کہ شاہ صاحب نے کتاب کے ابتدائی حصہ میں وضاحت سے حقیقت امامت پر بحث فرمائی ہے۔ پس یہاں "امام" سے مراد ایسی ہستی ہے جو وجاہت، سیادت، ہدایت وغیرہ کے مناصب پر فائز ہو مگر سیاست کے نظم میں اسے براہ راست کوئی دخل نہ ہو۔ (ن۔ص)

[2] "اجتماع کلمہ" سے مراد یہ ہے کہ جمہور مسلمین کو اس کی اطاعت پر متفق ہو جانا چاہیے (ن۔ص)

فسبیل من هلك. وان یقم لهم دینهم یقم لهم   دین ان کے لیے قائم رہا تو ۰ سال تک قائم رہے گا ....
سبعین عامًا ....

کلمۂ "ان یھلکوا" سے انتظام خلافت کی برہمی اور دورِ خلافت کے آخر میں ظہورِ فتنہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے،
کلمۂ "ان یقم لھم دینھم" سے دورِ نبوت، دورِ خلافت اور دورِ سلطنت کاملہ کے مجموعی زمانہ کی ترقیٔ اسلام مراد ہے۔
ایک اور حدیث میں وارد ہے کہ:-

تعوذوا باللہ من راس السبعین   ستر ہ سے اللہ کی پناہ مانگو۔

یہاں اشارہ ہے سلطنت کاملہ کے خاتمہ کی طرف، جس کو ملحوظ رکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا تینوں دور مل کر ایک زمانۂ برکت قرار پاتے ہیں اور وہ عظیم الشان شر و فساد (ملوکیت) جس سے خدا کی پناہ طلب کرنی چاہیے، اس مجموعی زمانہ کے خاتمہ پر ظہور پائے گا۔

اشارہ (۳) سلطان کامل کو ایک حد تک نیابت پیغمبری بھی حاصل ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اس کی ریاست کو خلافتِ نبوت نہیں کہہ سکتے، لیکن وہ سلطنتِ نبوت ضرور ہے۔ بعثتِ محمدیؐ کے متعلق ایک الہامی پیشگوئی کے یہ الفاظ اس مدعا کی طرف اشارہ کرتے ہیں:-

مهاجره طيبة وملكه بالشام   اس کا دار الہجرت طیبہ (مدینہ) اور دار السلطنت شام ہوگا۔

پس جس طرح کی اطاعت[1] کامل نبی کے لیے مطلوب ہے، اسی طرح کی اطاعت کامل کا حق دار سلطان کامل بھی ہے، باوجودیکہ سیرت کی تکمیل، تقرب الی اللہ کے حصول، خلق خدا سے حسن معاملہ اور بندگانِ خدا کی تربیت کے لیے حدودِ دیانت کی جو پابندی اور نورِ ہدایت کی جیسی پیروی ناگزیر ہے اس کا درس اس سے قطعاً نہیں لیا جا سکتا۔

اشارہ (۴) سلطان کامل حسن ظن کا مستحق ہے۔

سلطان کامل کے متعلق یہ تو طے ہے کہ وہ حقیقۃً ایمان و اخلاص کا مالک ہے، پھر بعض قابل قدر کارنامے بھی اس کے ہاتھوں سے انجام پاتے ہیں، نیز یہ کہ اس کے اقتدار سے ظاہر شریعت کو ترقی ملتی ہے۔ ان خوبیوں کے ساتھ اگر بشری تقاضوں کے ماتحت اصلاح اخلاق کے شعبے میں اس سے کوئی کوتاہی رہ جاتی ہے یا کوئی چیز سنت کے

---

[1] اطاعت کامل سے غیر محدود اور غیر مشروط اطاعت ہرگز متصور نہ ہونی چاہیے۔ مدعا یہ ہے کہ لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق کی اٹل شرط کے ساتھ اس کے احکام کی پوری طرح پیروی کرنی چاہیے۔ علاوہ بریں اطاعت کامل تنقید و تذکیر کے حق کو ہرگز سلب نہیں کرتی۔ آپ سلطانِ کامل کے تمام جائز احکام کی پابندی بھی کریں اور اگر اس کے ساتھ وہ اخلاقیت و روحانیت کی کمزوری کا جا بجا مظاہرہ کرے اور نفس پرستی کے لیے شریعت کی گنجائشوں کو ناپسندیدہ طریق سے استعمال کرے تو اسے دو در رو ہو کے نصیحت کیجیے، پریس اور منبر و محراب کی طاقت کو تنقید و تذکیر کے لیے استعمال کیجیے اور ارباب شوریٰ کو بھی اس مقصد میں اپنا ہم نوا بنایئے۔ لیکن بغاوت برپا نہ کیجیے، تا وقتیکہ آپ کو ضابطۂ شریعت اس کا حق نہ دیتا ہو۔ (ن۔ص)

خلاف[1] سرزد ہو جاتی ہے تو اس سے چشم پوشی ہی مناسب ہے۔ جہاں تک ہو سکے، دل و جان سے اس کی خیر خواہی کی جائے اور اس کے تھوڑے عمل کو بہت اور اس کی چھوٹی نیکی کو بڑا سمجھا جائے۔ اس رعایت کی وجہ یہ ہے کہ لذتِ نفسانی کی وارفتگی کے باوجود اس کے دل میں دینِ رب العالمین کی خدمت کا جذبہ کام کر رہا ہے ؎

کمالِ صدق و محبت بہ بیں، نہ نقصِ گناہ — کہ ہر کہ بے ہنر افتد نظر بہ عیب کند

۲۔ سلطنتِ جابرہ

سلطانِ جابر اس آمر کو کہیں گے جس پر نفسِ امارہ کا اتنا زیادہ غلبہ ہو چکا ہو کہ نہ خوفِ خدا اسے مانع ہو، نہ شرمِ مخلوق! نہ شرع کی پروا ہو، نہ عرف کا لحاظ! بس نفس کی طرف سے کوئی فرمان صادر ہوا تو جھٹ سے اس کی تعمیل ہو گی، چاہے شریعت موافق ہو چاہے مخالف۔ اس کے نزدیک تو اپنی خواہشات کو پورا کر لینا ہی سلطنت کا منتہائے مقصود ہے۔ ایسے لوگوں کا "نظامِ حکومت" "سلطنتِ جابرہ" کہلاتا ہے۔

یہ ملحوظ رہے کہ سلاطینِ جابرہ شرع کی مخالفت میں مزاج کی افتاد کے مطابق مختلف مدارج پر فائز ہوتے ہیں کوئی سرشارِ کبر و نخوت ہوتا ہے تو کسی دوسرے کو ناز و تبختر کے مظاہرہ کا خاص ذوق ہوتا ہے، کسی کو جور و تعدی سے اور کسی کو فسق و فجور سے خاص مناسبت ہوتی ہے۔ کوئی صنفی لذات میں سرمست ہے تو کوئی شرابِ گلگوں کا رسیا ہے ایک چٹ پٹے کھانوں کا شیدا ہے اور دوسرا نفیس پوشاکوں پر فریفتہ۔ کہیں کھیل تماشہ سے زیادہ دلچسپی ہے اور کہیں نغمہ و سرود سے خاص وابستگی ہے۔ بہر حال ہوا و ہوس کے راستے بے شمار ہیں اور نفس پرستی کی شکلیں لاتعداد اور اگر ان کی تفصیل شروع کر دی جائے تو اسے پورا کرنے کے لیے کئی صفحے چاہئیں۔ یہاں اس شجرِ خبیثہ کی چند بڑی بڑی شاخوں کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے، جن سے آگے بے شمار فروع نکلتی ہیں۔

۱۔ **سفاہت** | مخالفتِ شرع کی ایک وجہ سلطانِ جابر کی سفاہت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ نعمتِ عقل و خرد سے جو شخص محروم اور دور اندیشی کے فن سے کورا ہو، وہ کسی اصول و مسلک کی پیروی میں استقامت کیا دکھائے گا اور اس سے متانت کی توقع کیونکر کی جا سکتی ہے! اس کے نزدیک وفا و استقلال کی صفت کو کوئی قیمت حاصل نہ ہو گی۔ نہ ننگ و عار کا اسے ذرہ بھر پاس ہو گا۔ اپنی سفاہت کی وجہ سے وہ ہر خواہش کو جس کا گذر آدمی کے دل میں ہو سکتا ہے

---

[1] سلطانِ کامل کو جو سب سے بڑی رعایت دی جا سکتی ہے وہ یہی ہے کہ مسلمان اس کی اطاعت کریں مگر یہ کہ اس کی کوتاہیوں سے چشم پوشی کی جائے اور اس کے معمولی اعمال کو اصل سے دگنا چوگنا تصور کیا جائے، ایسی رعایت ہمارے نزدیک مضر مقصد ہے۔ امراء کے متعلق یہ صورت اختیار کرنے کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو گا کہ ہر اگلا قدم زوال کی طرف اٹھے، جیسا کہ خلافتِ راشدہ کے بعد کی سیاسی تاریخ میں ہوا ہے۔ جس نظامِ سیاسی میں فردِ واحد کے بگاڑ پر پوری ریاست کا بگڑ جانا منحصر ہو، اس میں یہ کبھی بھی مناسب نہیں ہے کہ اس فردِ واحد کی ہر حرکت کو حسنِ ظن کی عینک لگا کر خوشنما بنا لیا جائے اور اس کے رائی کے دانہ جیسے کارناموں کو عقیدت کی خوردبین سے "ہزار گنا" کر کے دکھایا جائے۔ جی نہیں! اگر ریاست اور رعایا اور دنیا کے عظیم الشان مفاد کا ہمیں پاس ہو گا تو ہم ادنیٰ سے (بقیہ صفحہ ۲۸ پر)

فوراً پوری کرنے کی فکر کرے گا۔ یہ ہرگز نہ دیکھے گا کہ اس سے کیا نفع و نقصان ہو سکتا ہے اور اس کا آخری نتیجہ کیا ہونے والا ہے۔ وہ جو کچھ کرے گا، بالکل بچوں کی طرح دیوانہ وار کرے گا اور جہاں جہاں منہ مارے گا ٹھیک شتر بے مہار کی طرح مارے گا۔

اس طرز کا آدمی جب منصب سلطنت پر براجمان ہوتا ہے تو سیاست کا سارا کاروبار چوپٹ ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کے کرتوت نہ قوانین شریعت کے پابند ہوتے ہیں، نہ آئین عرفی کے مطابق۔ ایسے شخص کی سلطنت میں کون ہے جو نالاں نہ ہوگا؟ چھوٹے بڑے اور خواص و عوام سبھی دکھ پا پا کر فریاد کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسی بلائے عظیم ہے جس کی گرفت سے نادان و دانا اور غافل و ہشیار سبھی چھوٹ جانا چاہتے ہیں۔ ذیل کی حدیث میں اسی بلائے عظیم کی طرف اشارہ ہے

اعیذک باللہ من امارۃ السفہاء وقال — میں تمہارے لیے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں بیوقوفوں کی امارت سے اور فرمایا

تعوذوا باللہ من رأس السبعین وامارۃ الصبیان — کہ اللہ کی پناہ مانگو ستر ہجری سے اور لونڈوں کی حکومت سے۔

یوں بھی فرمایا کہ:-

ھلاک امتی علی ایدی غلمۃ من قریش — میری یہ امت قریش کے چند چھوکروں کے ہاتھوں تباہ ہوگی۔

ب۔ عیش پرستی آپ جانتے ہیں کہ بعض لوگ کسی جبلی سبب کے تحت اپنی قوت شہوانیہ سے مغلوب ہو جاتے ہیں ایسے لوگوں کی ساری قوتیں لذتوں اور راحتوں کے حصول میں صرف ہوتی ہیں اور ان کی عقل عیاشی کی بھول بھلیاں میں گم رہتی ہے۔ دن رات چٹ پٹی غذاؤں، اور دلفریب لباسوں اور سرور بخش شرابوں کے موضوع پر کاوشیں ہونگی، شطرنج بازی اور نے نوازی کا مشغلہ ہوگا، رقص و سرود کے چرچے ہوں گے، عورتوں اور لونڈوں میں انہماک ہوگا، محلات تعمیر کرنے اور دلکش باغات لگانے میں خاص توجہ رہے گی وغیرہ۔ فکر و تدبر کے گھوڑے ان میدانوں میں خوب دوڑائے جائیں گے اور دل کھول کر داد فسق دی جائے گی۔

اس قماش کے لوگ جب منصب سلطنت پر قابض ہو جاتے ہیں تو بذلہ سنج لوگ ان کے درباروں میں جمع ہونے لگتے ہیں اور خوب اچھی طرح بھانپ لیتے ہیں کہ یہاں رغبت صرف لذتوں اور راحتوں کی طرف ہے۔ پس وہ سب کھیل تماشے اور رنگ رنگ کے نئے نئے ڈھنگ ایجاد کرنے میں لگ جاتے ہیں اور ایک ایک شغلہ کو بڑا لمبا چوڑا فن لطیف بنا کر چھوڑتے ہیں۔ پھر مدتوں محنت کر کر کے اسے کمال کو پہنچاتے ہیں۔ عیش پسند سلاطین بھی ایسے ہی فنون کے ماہرین کو اپنا مقرب اور خیرخواہ شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ جو کوئی مانا ہوا عیاش یا بے حیا بھانڈ ہو یا چالباز دیوث ہو یا طبلہ سارنگی کا استاد ہو، وہی دربار سلطانی میں مسند آرا ہوگا۔

لیکن فسق و فجور کی یہ گرم بازاری دولت کو پھونکے بغیر کمال کو نہیں پہنچ سکتی، اسے جاری رکھنے کے لیے خزانے

(بقیہ حاشیہ صفحہ) ادنیٰ بگاڑ پر ٹوکیں گے اور اس کے ایک ایک فیصلہ پر زبان اور قلم سے بحثیں ہوں گی تاکہ رائے عامہ بھی اپنے ساربان کی روش سے پوری طرح خبردار رہے اور ہر صاحب امر بھی چوکنا رہے کہ وہ چاروں طرف سے دیکھنے والی بیدار آنکھوں کے درمیان گھرا ہے۔ ہاں البتہ اس امر کا پاس کرتے ہوئے کہ صاحب امر ایمان و اخلاص کا مالک ہے، برضا و رغبت اس کی اطاعت کی جائے گی۔

(ن۔ ص)

بھرپور ہونے چاہئیں۔ چنانچہ سلاطین جابرہ مجبور ہوتے ہیں کہ مال جمع کرنے کے لیے رعایا پر قسم قسم کے جور و ستم روا رکھیں اور بے دھڑک دست درازی کا مظاہرہ کریں۔ اس سے لازماً ملک میں تباہی پھیلتی ہے، مفلس اور کمزور لوگ بے خانماں ہو جاتے ہیں اور تاجر و زمیندار بدحال۔ اتنا ہی نہیں، یہ طوفان فسق و فجور بعض صورتوں میں آبرومندوں کی بے آبروئی اور پردہ داروں کی پردہ دری پر منتج ہوتا ہے۔ اور یہ حالت بھی سلطنت کی تباہی کا سامان بنتی ہے۔ پھر یہ کہ سلطان جب کھیل تماشوں اور نغموں شرابوں میں مستغرق ہو گیا، تو نظام حفاظت و عدالت کا بگڑ جانا لازمی ہے جس کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ رعایا میں باہم جور و ستم کا بازار گرم رہے۔ الغرض سلاطین کا فسق و فجور رعایا کی بدحالی اور ملک کی تباہی کا سبب بن جاتا ہے۔ فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے:۔

ان هذا الامر بدأ نبوة ورحمة ثم يكون خلافة ورحمة ثم ملكا عضوضا ثم ملكا جبرية وعتوا وفسادا في الارض يستحلون الحرير والفروج والخمور، ويرزقون على ذلك وينصرون حتى يلقوا الله

یہ نظام نبوت و رحمت سے شروع ہوا، پھر خلافت و رحمت بنے گا، پھر سلطنت مستبد کی شکل اختیار کرے گا پھر جبر، سرکشی، اور الفساد فی الارض کی مملکت بن جائے گا (اس وقت کے امرا و سلاطین) ریشم، عورت اور شراب کو بالکل حلال کر لیں گے، اور اسی قسم کی کارروائیوں پر لوگوں کو عطیے دیں گے اور ان کی مدد کریں گے، یہاں تک کہ اللہ سے جا ملیں گے۔

اس حدیث میں سلطنت جبر کی مکمل تعریف آ گئی ہے جس سے اس کی ماہیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

فسق و ظلم کی یہ بادشاہت پوری امت کے لیے ایک خوفناک مصیبت ہوتی ہے، خصوصاً اس وجہ سے کہ اہل دین و دانش سلاطین وقت سے دور بھاگتے ہیں اور ان کی مجالس سے کنارہ کشی کرتے ہیں، اور ان کا تقرب نہیں چاہتے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی معاش میں خلل آ جاتا ہے اور اطمینان قلب سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اس حال میں وہ اصلاح معاد کی طرف پوری طرح متوجہ نہیں ہو سکتے، اور نہ ان کی پوری مساعی جستجوئے راہ حق پر صرف ہو سکتی ہیں۔

لیکن اگر وہ سلاطین وقت کے تقرب کو پسند کریں اور وہی ڈھنگ سیکھ لیں جو ان کے تقرب کا لازمہ ہیں تو اس صورت میں انھیں سب سے پہلے دین و ایمان سے دست بردار ہونا پڑے گا، پھر عزت و آبرو کو چھوڑنا ہو گا، پھر فحش گوئی کو اپنا خاص کمال اور نغمہ سرائی کو اپنا خاص ہنر قرار دینا ہو گا۔ پس ان کے لیے بہتر یہی ہے کہ سلاطین (جابرہ) کی ملازمت اختیار کر کے اپنے دین و ایمان کی جڑ پر کلہاڑا نہ چلائیں۔ انھیں یہ خیال ہرگز دل میں نہ لانا چاہیے کہ اپنا دین بھی بچا لیں گے اور زندگی کے معاشی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے دربار سے کچھ کما بھی لائیں گے۔ ایسا خیال کرنا خوش فکری اور غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں۔ ؎

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں
ایں خیال است و محال است و جنوں

ج۔ حب مال | عموماً ایسے اشخاص دنیا میں پائے جاتے ہیں جنھیں پیدائشی طور پر مال کی غیر معمولی حرص ہوتی ہے، مگر حرص بھی اس عجیب قسم کی، کہ فقط گوناگوں اموال کے جمع ہو جانے ہی پر اس کی باچھیں کھل جاتی ہیں اور حصول لذت کے لیے کچھ خرچ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ یہاں تو نفس اجتماع دولت ہی سب سے بڑی لذت اور اس کی

کثرت ہی سب سے بڑی راحت ہے۔ ایسے لوگ جب اپنے خزانوں اور دفینوں کی اک جھلک دیکھتے ہیں تو باغ باغ ہوجاتے ہیں اور انھیں ترقی دینے کی خواہش دلوں میں اور بھڑک اٹھتی ہے، چنانچہ خزانے سمیٹنے کے لیے سو طرح کے دکھ سہتے ہیں اور ہزار طرح کی مشقتیں برداشت کرتے ہیں۔ حد یہ کہ بھوکے ننگے رہ کے عمر گزار دینگے مگر کیا مجال کہ اپنے خزانے میں سے ایک دمڑی بھی صرف کر سکیں۔

اب خود ہی غور کیجیے کہ ایسے لوگ اگر نظامِ سلطنت پر قابض ہوجائیں تو ان سے بجز اس کے اور کیا توقع ہوسکتی ہے کہ اپنی حرص کی آگ خوب بھڑکائیں۔ چنانچہ اہلِ زراعت و تجارت سے لے کر اغنیاء و فقراء تک سے حقِ حکمرانی (ٹیکس) وصول کرتے ہیں وہ بھی اس اہتمام کے ساتھ کہ مچھر کی ٹانگ سے لے کر چیونٹی کے انڈے تک کوئی چیز حساب سے باہر نہ رہے اور ایک رائی کا دانہ بھی کسی کو معاف نہ کیا جائے۔ بلکہ ان ظالموں کی تو دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ رعایا کے کسی فرد سے کوئی جرم سرزد ہو یا کوئی قصور کسی پر ثابت ہوجائے تو اس کی پکڑ دھکڑ اور سزا و تعزیر کے دوران میں اس کے مال و اسباب کو بلطائف الحیل اڑا لیا جائے۔ ایسے لوگ خود بھی رات دن یہی سوچتے رہتے ہیں کہ رعایا سے کس طرح مال ہتھیایا جائے اور ان کے درباری بھی اسی موضوع پر عقل لڑاتے رہتے ہیں۔ اب جس نے پرایا مال مارنے کے لیے کوئی کارگر تدبیر گھڑ لی اور جس نے رعایا کو جُل دینے کا کوئی کامیاب گُر ڈھونڈ نکالا، وہی ان کا خاص امیر ہے۔ وہی خیرخواہ وزیر ہے اور وہی مخلص مشیر! اس طرح سلطانِ جابر اور اس کے درباریوں کی مسلسل کاوشوں سے حیلہ سازی اور فریب بازی کے فنونِ لطیفہ اپنے کمال کو پہنچتے ہیں اور ان کے اصول و فروع مدون ہوجاتے ہیں۔

رہا بخل، سو اس کے تقاضے کے ماتحت ظالم سلاطین اپنے ملازمین سے یہ تو چاہتے ہیں کہ وہ وفاداری سے خدمت کریں اور اس خدمت کو اپنا فخر سمجھیں، مگر یہ گوارا نہیں کرسکتے کہ خزانہ سے کوئی ایک تنکا بھی نکالا جائے یا دفینہ میں سے ایک کوڑی بھی کم ہوجائے۔ چنانچہ ان سے خدمت لینے کے لیے کتنی ہی چالبازیوں سے کام لیتے ہیں اور ریاست و سیاست کی کامیابی کے لیے خلق اللہ کو بالکل مصنوعی خلق سے رام کرتے ہیں، نیز جب مناسب سمجھتے ہیں کسی ملازم پر کوئی الزام قائم کرکے اس کی گذشتہ خدمات کو برباد کردیتے ہیں اور جہاں مناسب سمجھتے ہیں اپنے خدام کو محض تعظیم و تکریم کے نشہ میں مست رکھتے ہیں۔ ان باتوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ خدمت تو لیتے رہیں مگر معاوضہ کچھ نہ دینا پڑے، یا اگر دینا ہی پڑے تو ایسے ڈھنگ سے دیا جائے کہ ملازمین کو پورا پورا حق نہ ملنے پائے بلکہ ان کے حق میں سے جتنا ممکن ہو خزانہ میں روک لیا جائے۔ مثلاً سونے چاندی میں سے کھرا مال بچا کے رکھیں گے اور کھوٹی دھات سے معاوضے ادا کرینگے یا یہ کہ زمانۂ خدمت کا کچھ حصہ حساب سے خارج کردینگے۔ یا پھر یوں ہوگا کہ ایک عرصہ تک مفت خدمت لینے کے بعد ان کا نام دفتر کے رجسٹروں میں درج کریں گے، وغیرہ!

اس قسم کی بخیل و حریص پادشاہت آخر مملکت کو تہ و بالا کرکے چھوڑے گی اور حکومت کی جڑوں کو کھوکھلا کردے گی۔ لیکن پھر بھی رعیت کے لیے یہی مناسب ہوگا کہ سلطانِ بخیل کے افکار و کردار پر صبر کرے اور اس سے متصادم نہ ہو۔ ورنہ اس کا اندیشہ ہے کہ وہ [ل ه] اب تک جو کچھ چرب زبانی اور فریب کاری کے پس پردہ کر رہا ہے، اسے دھڑلے سے سرانجام

ل ه (حاشیہ صفحہ ۳۱ پر)

دینے لگے گا اور خوب کھل کر ستم ڈھانا شروع کر دے گا۔ وجہ یہ کہ طمع اس کے خمیر میں شامل ہے اور اگر کسی وقت اس پر مال حاصل کرنے کے دروازے بند ہو جائیں گے تو وہ اپنی جبلت کے تقاضے سے مجبور ہو کر آمادہ ظلم ہو جائیگا۔ نبی صلعم نے حضرت ابوذرؓ سے فرمایا کہ

كيف انتم وائمة من بعدى يستأثرون بهذا الفئ؟ قال ابوذر: اما والذى بعثك بالحق اضع سيفى على عاتقى ثم اضرب به حتى القاك. قال: او لا ادلك على خير من ذلك؟ تصبر حتى تلقانى

میرے بعد کے ان امرا کے زمانہ میں تمہارا رویہ کیا ہو گا جو اس بیت المال کو خرچ کرنے میں اپنے کو دوسروں پر ترجیح دیں گے؟ حضرت ابوذرؓ نے جواب دیا کہ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا، اس وقت میں اپنی تلوار اپنی گردن پر رکھ دوں گا اور اس کو تن سے جدا کر لوں گا تاکہ آپ سے جا ملوں۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا کیا میں تم کو اس سے بہتر راہ نہ بتا دوں؟ اس وقت تم صبر کرنا یہاں تک کہ مجھ سے آملو۔

پھر فرمایا:۔

انكم سترون بعدى اثرة وامورا تنكرونها[له]

تم میرے بعد (غیروں پر اپنے حقوق کو) ترجیح (دینے والے امرا) پاؤ گے اور ایسے امور دیکھو گے جن کو تم برا سمجھو گے۔

وروى ان الصحابة قالوا يا نبى الله ارأيت ان قامت علينا امراء يسألونا حقهم ويمنعونا حقنا فما تأمرنا؟ قال اسمعوا واطيعوا فان عليهم ما حملوا وعليكم ما حملتم

اور روایت ہے کہ صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ صلعم اگر ہم پر ایسے امرا مسلط ہو گئے جو ہم سے تو اپنا حق لے لیں لیکن ہمارے حقوق ادا نہ کریں تو اس وقت ہمارے لیے آپ کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا ان کی سننا اور ان کی اطاعت کرنا، کیونکہ ان کی کمائی کا بار ان کے اوپر ہے اور تمہاری کمائی کا بار تمہارے اوپر۔

شوق مردم آزاری و خونریزی

بعض اشخاص اپنی فطرت کے اعتبار سے مغلوب الغضب اور شتر کینہ ہوتے ہیں۔ ایسوں کا جب غصہ ابلتا ہے تو ترش روئی اور بدگوئی کی حد کر دیتے ہیں۔ اور موذی پن کے مظاہرہ میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ یہ تو ان کے لیے ممکن ہی نہیں کہ مجرم کے قصور کی نوعیت کا خیال کریں، بلکہ قانوناً اگر مجرم کی خطا معمولی درجہ کی ہو تو انھیں اور زیادہ غصہ آتا ہے کہ وہ کوئی جرم عظیم کیوں نہ کر کے آیا۔ ایسے ارباب ظلم جرم کو عقل کے کانٹے پر کیوں تولنے لگے۔ بس اندھا دھند ادنیٰ سے ادنیٰ غلطی پر بھی قتل اور قرقی اور تذلیل و تحقیر سے کم درجہ کی سزا تجویز نہ کریں گے، کیونکہ اس کے بغیر ان کو اطمینان قلب اور سکون خاطر حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر کسی گروہ کا محض ایک فرد اگر ان کی مخالفت کر بیٹھا تو سمجھ لیجیے کہ اس پورے گروہ کی شامت آئی! اچھا برا کوئی نہ بچنے پائے گا۔

(حاشیہ صفحہ ۳۰) کوئی وجہ نہیں کہ جو سلطان اسلامی مالیات کا نظم تہ و بالا کر رہا ہو اور بالواسطہ ریاست کے اندر معاشی واقتصادی فساد پھیلا رہا ہو، اس کی کارگذاریوں پر ارباب دین و دانش چپ بیٹھے رہیں۔ حدیث ابی ذرؓ کی رو سے اتنے صبر کا مطالبہ تو کیا جا سکتا ہے کہ تلوار نہ اٹھائی جائے لیکن یہ صبر بے جا صبر ہو گا کہ زبان اور قلم کو بھی حرکت سے روک رکھا جائے۔ یہ اندیشہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ اگر سلطان بخیل کی روک ٹوک ہوتی تو وہ اور زیادتیاں کرے گا، حالانکہ اگر روک ٹوک نہ ہو تو مزید زیادتیوں کا امکان زیادہ ہے اور اگر تنقید و تنکیر اسے بھڑکائے بھی تو اس کا نتیجہ یہی ہو گا کہ سلطان ان حدود سے آگے نکل جائے جن کے اندر اس کے خلاف خروج کی اجازت نہیں ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو کچھ برا نہیں۔ انقلاب کا ایک ریلا از سر نو خالص خلافت راشدہ کو ابھار دے گا۔ (ن۔ص)

[له] اس روایت سے کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ اس کا مدعا یہ نہیں ہے کہ اگر تم سے معصیت خالق کا مطالبہ کیا جائے تو بھی اپنے امرا کے مطیع رہو۔ ہرگز نہیں۔ اس میں صرف یہ کہا جا رہا ہے کہ اگر امرا تمہارے حقوق تمہیں نہ دیں تو صبر کرو اور نظام جمع و اطاعت کو برقرار رکھو، یعنی خروج و بغاوت سے اجتناب کرو۔ امرا کا بوجھ امرا کے سر اور تمہارا تمہارے سر لیکن اگر حقوق اللہ ہی کو یہ لوگ پی جائیں تو پھر مسلمان کے لیے اطاعت کو برقرار رکھنا ممکن نہیں ہے۔ (ن۔ص)

اب اگر دنیا کی بدقسمتی سے ایسے ہی لوگ مسندِ سلطنت پر متمکن ہوجائیں تو وہ داد ظلم وجور نہ دینگے تو کرینگے کیا؟ یہ ظالم خدا کے بندوں کو طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا کرتے ہیں اور عزت داروں کو ذلیل وخوار کرکے چھوڑتے ہیں۔ غلط نہ ہوگا اگر انھیں بنی آدم کے لیے بھیڑیے یا کٹ کھنے کتے سمجھا جائے۔ ان کے زہریلے ڈنک سے نہ مساکین بچتے ہیں، نہ عزت واعتبار والے، نہ غریبوں کو ان سے پناہ ملتی ہے نہ امیران کے گزند سے متشنیٰ ہوتے ہیں ان کی ایذا رسانی ہوتی اس درجہ کی ہے کہ غریب اور بے بس مسلمان ان کی "اسلامی حکومت" سے کفار کی کافرانہ حکومت کو ہزار درجہ بہتر سمجھنے لگتے ہیں اور وہی ان کے نزدیک خدا کے بندوں کے لیے جائے امن قرار پاتی ہے۔ ایسی حالت میں ادھر رعایا سلطان ظالم سے رنجیدہ ہوتی ہے اور ادھر سلطان ظالم بھی اپنے رعایا سے بیزار رہتا ہے۔ بس یہ اس کی تباہی میں خوش، تو اس کے زوال میں راضی۔ اس حالت کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :-

خیار ائمتکم الذین تحبونھم ویحبونکم وتصلون علیھم ویصلون علیکم وشرار ائمتکم الذین تبغضونھم ویبغضونکم وتلعنونھم ویلعنونکم

تمہارے امرا میں سے بھلے وہ ہیں کہ تم ان سے محبت کرو، وہ تم سے محبت کریں اور تم ان کے لیے دعائے رحمت کرو اور وہ تمہارے لیے دعائے رحمت کریں اور تمہارے امرا میں برے وہ ہیں کہ تم ان سے نفرت کرو اور وہ تم سے نفرت کریں اور تم ان پر لعنت کرو، وہ تم پر لعنت کریں۔

سلطانی مظالم جس طرح رفتہ رفتہ رعایا کی معاش کو تباہ و برباد کرکے رکھ دیتے ہیں اسی طرح ان کے شجر ایمان کی جڑیں بھی کھود دیتے جاتے ہیں۔ آخر لوگ اقامت دین وایمان کی فکر کیا کریں گے، جبکہ انھیں سلطان ظالم کے خوف سے ایک ساعت بھی مخلصی نہیں ہوتی۔ چنانچہ سلطنتِ ظالم کا قیام کسی مذہبِ باطل کے پھیل نکلنے کے مشابہ ہے جو ملت کے نظام اور سنت کے آئین وحدود کو توڑتا چلا جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :-

انما اخاف علی امتی الاستسقاء بالانواء وحیف السلطان والتکذیب بالقدر

مجھے اپنی امت کے بارے میں صرف یہ خوف ہے کہ (۱) وہ نچھتروں سے بارش طلب کریگی (۲) بادشاہ اس پر ظلم ڈھائینگے (۳) اس میں قضا وقدر کا انکار پیدا ہوگا۔

سلطانِ ظالم بعض وجوہ کے ماتحت اگر کسی گروہ سے رنجیدہ ہوتا ہے اور اس سے انتقام لینے پر تل جاتا ہے تو اس کے انتقام کی تلوار مطیع اور غیر مطیع اور گنہ گار وبے گنہ میں ہرگز امتیاز نہیں کرتی بلکہ بے دریغ سروں کو کاٹتی چلی جاتی ہے اور ملکوں اور شہروں کو بے چراغ کرکے چھوڑتی ہے۔ حدیث میں وارد ہے کہ :-

من خرج علی امتی بسیفہ یضرب برھا وفاجرھا ولا یتحاشی من مومنھا ولا یفی لذی عھد عھدہ فلیس منی ولست منہ

جس شخص نے اپنی تلوار لیکر میری امت پر حملہ کیا اور نیک وبد میں تمیز نہ کی اور نہ امت کے سچے مومنوں کو قتل کرنے سے پرہیز کیا اور نہ کسی اپنے عہد کا پاس لحاظ رکھا اس کا نہ مجھ سے کوئی تعلق ہے اور

پھر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی گروہ کے متعلق سلطان ظالم کے دل میں آتش غضب بھڑکتی ہے لیکن حالات ایسے نہیں ہوتے کہ عملاً انتقام لیا جاسکے، اب لازماً اس کے سینے میں کینہ پرورش پاتا رہے گا اور وہ اس تاک میں رہے گا کہ اس کینہ کی بھڑاس نکالنے کا کب مناسب موقع پیدا ہوتا ہے۔ نبی صلعم سے روایت ہے۔

ما من والٍ یلی رعیۃ من المسلمین فیموت وھو غاش لھم الا حرم اللہ علیہ الجنۃ

جو حکمراں بھی اپنی مسلم رعایا پر غدر اور خیانت کے ساتھ حکومت کرتا ہوا مرگیا اس پر اللہ تعالیٰ نے جنت حرام کر دی ہے۔

(باقی)

قانونِ بقائے انفع

اجتماعیات میں تحفظِ حق وعدل کا فطری اہتمام

(۲)

بحث کا پہلا حصہ انفرادی اخلاق سے متعلق تھا۔ انفرادی اخلاق کی اہمیت اجتماعیات میں اس وجہ سے ہے کہ ہر اجتماعی ہیئت افراد ہی کی اکائیوں کا مجموعہ ہوتی ہے اور ذہن وشعور صرف افراد کو حاصل ہے جس کی وجہ سے تمام تر ذمہ داریاں بالآخر افراد ہی پر عائد ہوتی ہیں۔ یہ بات اگر نہ ہوتی تو ہم انفرادی اخلاق پر اجتماعیات میں کوئی بحث نہ کرتے اور براہِ راست جماعتوں اور اجتماعی نظاموں پر گفتگو چھیڑتے۔ سو فرد کے متعلق جو بحث کرنی تھی ہو چکی۔ اب ہمیں اپنے اصل موضوع کی طرف پلٹنا ہے۔ یعنی یہ کہ قانون بقائے انفع کا عمل جماعتوں کے معاملہ میں کیا ہے؟ جماعتوں کو کیا چیز ابھارتی ہے؟ انھیں انسانی آبادیاں کس بنا پر سندِ قبولیت دیتی ہیں؟ پھر کیا اسباب انھیں اقتدار سے معزول کرتے ہیں؟ کیا اقتدار ان جماعتوں کے لیے ہے جو ظلم توڑنے کے لیے زیادہ سے زیادہ قوت فراہم کرلیں یا ان کے لیے جو اپنے آپ کو نوعِ انسانی کی خدمت کے لیے پیش کریں؟

مغرب نے تو ہمیں صرف اتنا بتایا ہے کہ کامیاب صرف وہ گروہ ہوتے ہیں جو "اقوی" ہوں، مگر یہ ہمارے سوال کا تسلی بخش جواب نہیں ہے۔ ہمیں تو یہ معلوم کرنا ہے کہ کوئی گروہ اقوی کس بنا پر ہوتا ہے؟ "اظلم" ہونے کی وجہ سے یا "اعدل" ہونے کی بنا پر؟ دوسرے لفظوں میں کیا انتفاع وجہِ قوت ہے یا خدمت؟ لوگ اپنی باگ ڈور کیا اس گروہ کے حوالے کرنا چاہتے ہیں جو ان کا سینہ روندے، ان کا گلا گھونٹے، ان کا چہرہ لہولہان کرے اور عام انسانی آبادی پر ارتقار کی راہ بند کرکے صرف اپنے آپ کو آگے بڑھانے کی فکر کرے؟ یا پھر یہ وہ گروہ رعنائے انسانیت حاصل کرسکتا ہے جو کمزوروں اور ضعیفوں اور کچلے جانے والوں کو ظالموں اور متکبروں کے پنجے سے نجات دلاکر اپنے پہلو میں کھڑا کرے اور طاقتور کو کمزور کی دستگیری کا سبق سکھائے؟ بس یہی اصل مرکزی سوال ہے جو اس مضمون میں پیشِ نظر ہے۔

اجتماعیات میں قوت کی حقیقت اوپر کا سوال حل کرنے سے پہلے یہ طے کر لینا ضروری ہے کہ اجتماعیاتی یا جماعتی قوت کی ماہیت کیا ہے؟ ـــــ وہ قوت جو تمدنی وسیاسی نظاموں کو جوڑتی توڑتی ہے! مغربی فلسفہ کی سطح بینی نے زیادہ تر توپ و تفنگ کو فیصلہ کن طاقت قرار دیا ہے، جسے حاصل کر لینے والا گروہ زندگی کی مسابقت میں آگے بڑھ سکتا ہے، مگر توپ و تفنگ آسمانوں سے ڈھلے ڈھلائے تو ٹپکتے نہیں، خود انسانوں کو بنانے پڑتے ہیں۔ پس اس قوت کا حصول دو باتوں پر منحصر ہے، ایک تو قدرتی وسائل، دوسرے کسی آبادی کی دماغی ترقی؛ ـــــ اور مغرب ہمیں یہ بتاتا ہے کہ یہ دو سعادتیں جس انسانی جماعت کو

حاصل ہوجاتی ہیں، وہی آگے بڑھا کرتی ہے۔ دماغی ترقی طبیعی قوتوں پر انسان کی دسترس بڑھاتی ہے اور ان قوتوں کی مدد سے جماعتیں انسانی آبادیوں کو مسخر کرتی ہیں۔ اس تسخیر اور نفاذ و استحکام اقتدار میں زیادہ سے زیادہ جو تیسری قوت استعمال ہوتی ہے وہ سیاسی ساحری کا فن ہے جس کے بغیر "قاہری" کوئی بڑا نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی۔ سو مغربی تصور کے مطابق اجتماعی قوت کے اقانیم ثلاثہ یہ ہوئے:-

(ا) علوم طبیعی (ب)۔ قدرتی وسائل (ج)۔ سیاسی ساحری کا فن

مگر یہ "قوت اجتماعی" کا نامکمل تصور ہے۔ علوم طبیعی کا نشو و ارتقا اور قدرتی وسائل سے استفادہ کی صلاحیتیں اور سیاسی حکمت تو افراد انسانی کے دماغی کرشمے ہیں اور ان ہی کے اجتماع و تعاون سے اجتماعی قوت کا ظہور ہوتا ہے۔ اب سوچیے کہ یہ اجتماع و تعاون کیسے نمودار ہوتا ہے اور اس کا دائرہ کس طرح پھیلتا ہے؟

فرض کیجیے کہ آپ ایک دیس میں کھڑے ہو کر لوگوں کو یہ دعوت دیتے ہیں کہ آؤ اپنی اپنی صلاحیتوں اور استعدادوں کو ایک مرکز پر جمع کر دو۔ ماہرین علوم طبیعی اپنی اپنی تحقیقاتیں اور ایجادیں پیش کر دیں، علمائے سیاست اپنے اپنے "جادوؤں" کا مظاہرہ کریں، دولت و سرمایہ کے مالک اپنے مال ڈھیر کر دیں، مزدور اور دہقان اپنی محنت کی متاع پیش بہا لے کر حاضر ہو جائیں۔ —— کیا یہ آواز سنتے ہی دنیا تعمیل کرے گی؟ نہیں، ہرگز نہیں! وہ آپ سے دریافت کرے گی کہ ہم کاہے کو یہ دعوت مان لیں؟ چنانچہ آپ کو مقصد بتانا پڑے گا کہ آپ ایک اجتماعی ہیئت کی تشکیل کر کے سیاسی تمکن حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر آپ کا سیاسی تمکن فی نفسہٖ کسی کا مقصود نہیں ہو سکتا، آپ کو یہ بھی بتانا پڑے گا کہ اس تمکن کی غایت کیا ہے! چنانچہ آپ بتاتے ہیں کہ ہمارا مقصد نوع انسانی یا کسی ایک نسل و وطن کے فرزندوں کی فلاح و بہبود ہے۔ لیکن صرف اتنی توضیح بھی لوگوں کو آپ کے گرد جمع نہیں کر سکتی۔ آپ کو یہ بھی بتانا پڑے گا کہ فلاح و بہبود سے آپ کی مراد کیا ہے اور وہ کون سے اصولِ فکر و عمل ہیں جو جملہ بنی آدم یا آپ کی ہم نسل و ہم وطن برادری کی فلاح و بہبود کے ضامن ہو سکتے ہیں۔ ان سارے پہلوؤں سے اگر آپ خواص و عوام کی "رضا" حاصل کر سکے تو وہ اپنی ساری صلاحیتوں اور ساری مادی قوتوں کے ساتھ آپ کے گرد سمٹ آئیں گے۔ پس مادی قوتیں جماعتی نظام میں خارجی حیثیت رکھتی ہیں اور جماعت کی داخلی قوت وہ اصول و مقاصد ہیں جو انسانی رضا کو اپنی طرف جذب کرتے ہیں۔ پس جماعتی قوت کا شجرۂ نسب مختصراً یہ قرار پائے گا:-

اصول و مقاصد ← انسانی آبادی کی رضا ← مادی قوت ← تمکن فی الارض

انسانی رضا حاصل کر سکنے والے اصول و مقاصد کو جماعت کی ہیئت سے الگ کر دیجیے تو پھر آپ کے پاس نہ مادی قوت فراہم ہو سکے گی اور نہ تمکن فی الارض کا کوئی امکان رہے گا، بلکہ خود "جماعت" نام کی کوئی چیز بھی باقی نہ رہے گی، صرف منتشر افراد ہوں گے جن کے پاس ہر طرح کی صلاحیتیں ہوں گی مگر وہ کسی کام نہ آ سکیں گی! پس اصول و مقاصد جماعتوں کے لیے اصل قوت ہیں جن سے انسانی رضا ظہور کرتی ہے۔

اصول و مقاصد کی جاذبیت آگے چلنے سے پہلے ہمیں اصول و مقاصد کی جاذبیت کا راز ڈھونڈنا ہے، کیونکہ اس کے محور پر ہماری ساری بحث کا پہیہ گھومتا ہے۔ تو اب غور فرمائیے کہ آپ ارد گرد کی دنیا کو اگر اس مقصد کی طرف بلائیں کہ لوگو اٹھو اور "زید" کی فلاح و بہبود میں اپنی ساری مساعی صرف کرنے کے لیے جماعت بندی کر دو تو زید کے سوا شاید کوئی اور اس پر لبیک کہنے والا

نہ ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ اپنی بات کی پچ میں شاید آپ خود زید کا ساتھ دے جائیں ـــــ مگر اور کوئی "سر پھرا" آپ کو نہ ملے گا۔ اچھا پھر اگر آپ یہ دعوت دیں کہ "بکر" کی برادری کی بھلائی کے لیے جماعت بندی کی جائے تو کیا نتیجہ نکلے گا؟ یہ کہ بکر کی برادری آپ کے گرد جمع ہو جائے ـــــ مگر "زید" کی "عمر" کی "نتھو" کی "فتو" کی برادریاں تو آپ کی دعوت کو کوئی وقعت نہ دیں گی۔ پس معلوم ہوا کہ آپ کی دعوتِ فلاح کا دائرہ جتنے انسانی افراد کو محیط ہوتا ہے، آپ کی دعوت کی جاذبیت صرف انہی تک محدود رہتی ہے اور "رضا" صرف انہی کی حاصل ہو سکتی ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ اجتماعیات میں جن سیاسی جماعتوں سے ہم بحث کر رہے ہیں وہ تجارتی فرموں کی طرح نہیں ہوتیں، بلکہ ان کا خطاب پوری انسانیت یا کم از کم ایک نسل اور ایک وطن کے پورے لوگوں سے ہوتا ہے، کیونکہ سیاسی تمکن کا حصول بہت بڑی اجتماعی قوت چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ظاہر ہے کہ مطلوبہ مادی قوت ہر پہلو سے مکمل کرنے کے لیے ہر قسم کے انسانوں کی رضا مطلوب ہوتی ہے اور قوم یا نسل کا کوئی عنصر ایسا نہیں ہوتا جسے قطعاً نظر انداز کیا جا سکے۔ اہل مال و منال ہوں یا ارباب علم و فضل، ماہرین سیاست و تمدن ہوں یا مصنفین و اساتذہ، سپاہی اور انجینیر ہوں یا وکیل و ڈاکٹر، دہقان اور کسان ہوں یا مزدور اور قلی، تاجر اور سوداگر ہوں یا صناع اور اہل حرفت سبھی سے حسب استطاعت رضا اور مادی قوت کا چندہ لینا کسی سیاسی دعوت کے لیے ناگزیر ہے۔ پس کسی بڑے گروہِ انسانی کی رضا حاصل کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ من حیث المجموع اس پورے حلقہ کی فلاح و بہبود کو مرکزی مقصد قرار دیا جائے۔ اگر آپ فلاح و بہبود کے استحقاق سے کسی ایک عنصر کو محروم کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ اپنی دعوت میں اس کے لیے کوئی جاذبیت نہیں چھوڑتے بلکہ الٹا اس کے خلاف اس عنصر میں منافرت پیدا کرتے ہیں۔ تاہم جس گروہ کو بھی آپ مخاطب کر رہے ہوں اگر اس کے ہر ہر طبقے، ہر ہر عنصر اور ہر ہر فرد کی فلاح و بہبود آپ کا مقصد قرار پاتی ہے تو وہ مطلوبہ جماعت بندی کے قالب میں ڈھل جائے گا۔

اب ہم اس مقصد کے حصول کا اساسی اصول معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات تو روشن ہے کہ فطرت کی تنوع پسندی نے کوئی سے دو انسانوں کو بھی مساوی نہیں بنایا ہے بلکہ اس نے اپنے ہمہ گیر مذاق کے ماتحت کسی کو مضبوط بدن دیا ہے کسی کو کمزور، کسی کو سالم الاعضا بنایا ہے کسی کو ناقص الاعضا، کسی کو ذکی و ذہین پیدا کیا ہے کسی کو بلید و احمق، کسی کو کثیر الافراد قبیلہ قسمت کیا ہے کسی کو خاندان سے بالکل محروم کر دیا ہے، کسی کو ہنروری میں حاذق و چوبند بنایا اور کسی کو کمالِ فن کا زینہ چھونے بھی نہیں دیا۔ کسی کا ماحول ہمت افزا ہے اور کسی کا مایوس کن، کسی کو علم و فضل حاصل ہے اور کوئی جہل کی وادیوں میں بھٹک رہا ہے، کسی کو مال و منال میسر ہے اور کوئی افلاس و تنگ دستی میں گھرا ہوا ہے۔ کوئی طلاقتِ لسانی میں استاد ہے تو کسی کو سیدھی بات کرنی نہیں آتی، کوئی قلم سے دماغوں کو فتح کرتا ہے تو کوئی دوسرا الف بے لکھنا نہیں جانتا۔ پھر ان ذوق و اختلاف کے ساتھ انسانی طبائع میں کبر و خود پرستی کے ظہور کے امکانات بھی رکھ دیے ہیں اور عجز و سرافگندگی کے میلانات بھی! اب یہ مختلف صلاحیتیں رکھنے والے انسانوں کا انبوہ تمدن کے میدان میں اترتا ہے تو ہر طرف معرکوں اور تصادموں کا ایک طوفان امڈ آتا ہے۔ قوی قوت بازو سے کام لے کر ضعیف کی پیٹھ پر سوار ہو جاتا ہے۔ تونگر مال کے زور

سے مفلس کا خون چوسنے لگتا ہے، دماغ والا سادہ لوح کو زچ کرتا ہے، زبان کا استاد بے زبانوں کو نگل دے جاتا ہے اور انسان انسان کی اس کشمکش میں انسانیت دیوالیہ ہو جاتی ہے یعنی اس کے خزانۂ اجتماعی میں امن و مسرت کا ایک حبہ تک محفوظ نہیں رہ جاتا۔ "فطری عدم مساوات" کے ان خوفناک نتائج سے بچنے کے لیے انسان کو لازماً "اخلاقی مساوات" کے اصول پر اجتماعی نظم کی تشکیل کرنی پڑتی ہے جسے چلانے کے لیے وہ ریاست کے ادارے کو وجود دیتا ہے۔

اخلاقی مساوات کی صورت یہ ہوتی ہے کہ من حیث المجموع "انسان" کے فطری اور قانونی اور اخلاقی حقوق متعین کر دیے جاتے ہیں۔ اس تعین کو اہل قوت کی دسترس سے بچانے کیلیے ریاست "اجتماعی قوت" کو استعمال کرتی ہے جس کے مظاہر میں نظامِ عدالت و تعزیرات اور پولیس وغیرہ شامل ہیں۔ اس قوت کے فراہم کرنے میں نظامِ حکومت کو یہ ملحوظ رکھنا پڑتا ہے کہ جو زیادہ حصہ دینے کے قابل ہے وہ زیادہ دے اور جو کم دے سکتا ہے اس سے کم لیا جائے اور پھر اسے صرف کرتے ہوئے بھی یہ مدنظر رکھنا ہوتا ہے کہ جو کم محتاج ہے اسے کم ملے اور جو زیادہ محتاج ہے وہ زیادہ پائے۔ یوں سمجھیے کہ تمدن ایک ترازو ہے جس کے جھکتے پلڑے میں ارباب قوت و غنی ہیں اور اٹھتے پلڑے میں اہل ضعف و احتیاج۔ اب حکومت کا عمل یہ ہوتا ہے کہ دونوں پلڑوں کو برابر کر دے اور اسی کا نام اخلاقی مساوات ہے جس کے ماتحت ذمہ داریاں "قوت" پر عائد ہو جاتی ہیں اور ضعف کو حقوق ملتے ہیں۔ جو جتنا قوی ہوتا ہے وہ کمزور کے مفاد کا اتنا ہی زیادہ ذمہ دار ہوتا ہے اور جو جتنا ضعیف ہوتا ہے وہ ذمہ داریوں سے اتنا ہی بری اور حقوق سے اتنا ہی زیادہ مستفید ہوتا ہے۔ پس انسانی ہیئت اجتماعیہ کی مجموعی فلاح و بہبود کے وسیع مقصد کی طرف بڑھنے کے لیے جو اخلاقی مساوات ناگزیر ہے وہ ترازو کے پلڑوں کو برابر کرنے والے اصولِ عدل پر قائم ہوتی ہے۔ اس طرح جہاں مجموعی فلاح و بہبود پیش نظر ہو وہاں اس کے لیے اصولِ عدل پر دعوت دی جائے وہاں انسانی رضا کے لیے جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے۔

نظامِ خدمت یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصولِ عدل کی کچھ اور توضیح کر دی جائے۔ عدل کا مفہوم صرف یہی نہیں ہے کہ سوسائٹی کے مختلف عناصر میں توازن قائم کر دیا جائے بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ انسان جن مختلف تقاضوں پر فطرت کا مخاطب ہے ان سب کو پورا کیا جائے۔ ان مختلف حیاتی اور حیوانی اور اخلاقی تقاضوں میں سے کسی ایک کو نظرانداز کر دینا بھی اصولِ عدل کے منافی ہوگا۔ اسی طرح کسی تقاضے کو اس کی اصل حدود سے بڑھا چڑھا کر دیکھنا اور اسی طرح بعض تقاضوں کی اہمیت کو کم کر کے انھیں پیش نظر رکھنا بھی اصولِ عدل کی نفی ہے۔

مگر زندگی کے گوناگوں اعمال و کردار اور ضوابط و دساتیر میں روحِ عدل کا ساری ہونا اس امر پر منحصر ہے کہ عملیات کا خاکہ نظریات کے جن اساسی نقاط پر مرتب کیا جائے وہ سراسر حق اور مطابق واقعہ ہوں۔ پس جیسا کہ ہم انفرادی اخلاقیات پر بحث کرتے ہوئے مضمون کے حصہ اول میں واضح کر چکے ہیں عملیۂ عدل کیلیے نظریۂ حق لابدی اساس ہے۔ اسی اصول کے ماتحت جماعتوں کو کسی آبادی کی رضا حاصل کرنے کے لیے نظریۂ حق اور عملیۂ عدل دو لازم و ملزوم سرمایوں کی ضرورت ہے۔ جن کے مجموعے کو ہم "نظامِ خدمت" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ "نظامِ خدمت" یا نظامِ حق و عدل کی علمبرداری ہی سے جماعتوں میں نوعِ انسانی کے لیے افادیت اور نفعیت پائی جاتی ہے جس کی بنا پر وہ تمکن کی مستحق ٹھہرتی ہیں۔ اور نظامِ خدمت سے ہٹ جانے کے بعد وہ اپنی افادیت کو کھو دیتی ہیں اور جماعتوں سے افادیت کے سلب ہو جانے کے نتیجے میں انسانی رضا ان سے منہ پھیر لیتی ہے اور ان کے اقتدار

کے محل کو سیل لگ جاتی ہے، حتیٰ کہ اس کے کھنڈر   ایک دن نوحہ کرتے نظر آتے ہیں۔ یورپ نے بھی حق و عدل کی اہمیت کو "گول مول" طریقہ سے ضرور محسوس کیا ہے۔ کیونکہ ان کی افادیت ایک ایسی قطعی صداقت ہے جس سے انکار کرنے سے پہلے تاریخ نوعِ انسانی کے پورے دفاتر دریا برد کر دینے چاہئیں۔ پس جہاں تک اساسی نظریات اور تعبیراتِ حقائق کا تعلق ہے ان کا آخری گول "حق" ہی کو تسلیم کیا گیا ہے اور تمام اربابِ فلسفہ کا دعویٰ یہی ہے کہ ہمارا مشغلہ "تلاشِ حقیقت" ہے۔ ہم "دوامی صداقتوں" کا کھوج لگانا چاہتے ہیں اور ہماری حرکت "ظن" سے "یقین" کی طرف ہے۔۔۔۔ کیونکہ واقعات کی غلط تعبیرات پر تعمیرِ ضوابط کا انجام بخیر نہیں ہو سکتا۔ اسی غرض کے لیے انسان کے ذہن میں فطرۃً حق کو پا لینے کی خواہش بر سرِ عمل ہے۔ البتہ اس سلسلہ میں جو ٹھوکریں کھائی گئی ہیں وہ منحصر ہیں ان ذرائعِ علم کی کمزوری پر جو تجربہ و مشاہدہ کے میدانات آگے بڑھتے ہی اپنے اندھے پن پر سب سے بڑے گواہ خود ہی ہوتے ہیں۔

اسی طرح جہاں تک عملی اجتماعی ضوابطِ عمل کا تعلق ہے، دبے لفظوں نہیں، کھلے بندوں یہ مانا گیا ہے کہ "انصاف" ہی جماعتوں اور قوموں کے لیے وجہ بقا ہے۔ چنانچہ ابو الآبائے فلسفہ ارسطو نے اپنی "اخلاقیات" میں "اجتماعی عدل" کو بڑی اہمیت دی ہے اور اس کی توضیح میں یہ کہا ہے کہ "غیر منصفانہ قانون قانون نہیں ہے۔" گاڈون اس سلسلہ میں یہ کہتا ہے کہ:۔

"اخلاق و فرض کا معیار کیا ہے؟۔۔۔ انصاف! اور یہ اصول کسی خاص آب و ہوا سے مخصوص نہیں ہے، بلکہ اس دوامی شعور پر قائم ہے جو انسان کے ساتھ ہر زمانہ اور ہر ملک میں پایا جاتا ہے۔۔۔ اور اس اصول کی عام فہم شرح صرف یوں کی جا سکتی ہے کہ اپنی پوری قوتوں کے ساتھ سب کے مشترکہ مفاد کی خدمت کا نام انصاف ہے"!

پھر یہی شخص یہ بھی کہتا ہے کہ طاقت اگر وجہِ جوازِ حکمت ہو تو عدل کی قطعی نفی ہے"۔ پھر ارسطو کے سیاسی انصاف کی ایک شرح یہ کی گئی ہے کہ "قانونِ فطرت سے جو قانون متصادم ہے وہ قابلِ اتباع قانون نہیں ہے"۔ اس سے آگے بڑھ کر دوسری صورت توضیح کی یہ اختیار کی گئی ہے کہ "انسانیت کے مشترکہ قانون سے ہٹا ہوا قانون ناقابلِ برداشت ہے"۔۔۔ وغیرہ!

پھر آدم گاونزد وائٹ اپنی کتاب "مذہبِ کشادہ دلی" میں اعتراف کرتا ہے کہ "قانونِ ہمدردی (خدمت) ہی دراصل قانونِ ارتقا ہے"۔ اور فوادریکیا دلی جیسا بے بصیرت شخص یہ کہتا نظر آتا ہے کہ "اسلحہ کے لحاظ سے کوئی شخص لاکھ مضبوط ہو، مگر ایک علاقہ پر بہ حیثیت حکمراں قدم رکھنے کے لیے اسے مقامی آبادی کی "رضا" کی بھی ضرورت ہے اور اسی "رضا" کو نہ پا سکنے کی وجہ سے لوئیس دوازدہم نے میلان کے علاقہ کو جس تیزی سے فتح کیا، اسی تیزی سے گنوا دیا"۔ پھر ایک موقع پر وہ بزور کہتا ہے کہ "مظالم چاہے سلطنت جیت لیں مگر وہ حقیقی عظمت کو نہیں جیت سکتے"۔

اب چاہے تعبیرات کتنی ہی مختلف ہوں، مگر انسانیت کو گمراہ کرنے والے تمام اربابِ فلسفہ نے کسی نہ کسی صورت میں اس سچائی کو تسلیم کیا ہے کہ نظامِ عدل و انصاف کی تعمیر ہی اجتماعی فلسفہ کا مقصود ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ عدل و انصاف کا قطعی معیار نہ پا سکنے کی وجہ سے یہ مقصود اب تک حاصل نہیں ہوا ہے۔ اس امر سے انکار کرنا ناممکن ہے کہ نظامِ خدمت (نظریاتِ حق و ضوابطِ عدل) کی علمبرداری کے بغیر بھی جماعتوں کے لیے حصولِ اقتدار، بلکہ تحفظِ وجود کی کوئی راہ موجود ہے۔ نظامِ انتفاع اگر آپ ان سطور کو پڑھ کر شاید چونک اٹھیں گے اور کہیں گے کہ "ہیں! کیا فی الواقع حق و عدل ہی وجہ اقتدار

ہے ؟ کیا واقعی سیاسی تسلط لوگوں کی رضا پر منحصر ہے ؟ ـــــ اگر ایسا ہے تو یہ ہندوستان پر برطانیہ کی حکومت کیا معنی ؟ مزدوروں پر سرمایہ داروں کا تسلط کیسا ؟ لال ہندیوں اور حبشیوں پر سفید فاموں کی خدائی کیوں ؟ ـــــ آپ کا چونک جانا بجا ہے اور آپ کی کھٹک بہت معقول ہے ، مگر یہ ابھی صاف ہوئی جاتی ہے ۔

سب سے پہلے نظامِ انتفاع کی ماہیت سمجھ لیجیے ۔ یہ نظام "نظامِ خدمت" کی بالکل ضد ہوتا ہے ۔ یعنی اس کی علمبردار جماعتیں سب کے مشترک مفاد کے لیے نہیں ، بلکہ ایک حلقۂ انسانی میں سے کسی ایک عنصر کی خدمت کو نصب العین بناتی ہیں اور بقیہ عناصر سے انتفاع کرتی ہیں ۔ کچھ لوگوں کو اوپر چڑھانا اور کچھ کو نیچے گرانا اور گرائے رکھنا ان کو مطلوب ہوتا ہے ۔ پھر یہ فطرتِ انسانی کے بعض مطالبات کو تو خوب زور شور سے ابھارنے والی ہوتی ہیں لیکن بعض مطالبات کو سرے سے کوئی وزن ہی نہیں دیتیں ۔ پس ان کے ضوابطِ عمل بالکل "خلافِ وضعِ فطری" ہوتے ہیں اور ان کی اساس نظریاتِ باطل پر قائم ہوتی ہے ۔ ایسی جماعتیں جن لوگوں کے مفاد کی خدمت کرتی ہیں ان کی "رضا" تو انھیں عین قانونِ بقائے انفع کے تحت حاصل ہوتی ہے مگر جن عناصر سے انھیں انتفاع کرنا ہوتا ہے ان پر اگر ان کی حیثیت آشکارا ہو تو ان کی رضا کبھی بھی حاصل نہیں ہو سکتی ۔ پس اپنے نظامِ ظلم و جور کے ساتھ انتفاع پیشہ جماعتیں اگر ابھرتی ہیں تو "ساحری" ان کا خاص طریقِ کار ہوتا ہے جسے وہ بعض عناصر کے مفاد کے لیے بعض دوسرے عناصر کے خلاف استعمال کرتی ہیں ۔ یعنی حقیقتاً تو یہ قاتل و ظالم ہوتی ہیں مگر بظاہر مسیحائی کا دم بھرتی ہیں ۔ ظلم کے اسلحہ تو ان کی آستینوں میں پنہاں ہوتے ہیں مگر یہ جبہ اوڑھتی ہیں نظامِ حق و عدل کا ۔ آخر جادو چل جاتا ہے اور انھیں اقتدار مل جاتا ہے مگر جب یہ اقتدار کو استعمال کرنے لگتی ہیں تو ان کی اصل حقیقت فاش ہو جاتی ہے ۔ اس مرحلہ پر "مظلوم عناصر" کی رضا کا رخ ان سے پھر جاتا ہے اور وہ مزاحمت کرنے لگتی ہیں ۔ اس مزاحمت کو کمزور کرنے کے لیے انتفاع پیشہ جماعتوں کو "قوت" خرچ کرنی پڑتی ہے ۔ اب ایک انسانی حلقہ کی "رضا" کی نالی اس کے اقتدار کا حوض بھرتی رہتی ہے مگر دوسری طرف دوسرے حلقۂ انسانی کی نالی اسے خالی بھی کرتی جاتی ہے ۔ ابتدا میں حوض بھرنے والی نالی زیادہ کام کرتی ہے اور خالی کرنے والی کم ، مگر بعد میں تدریجاً پہلی کی رفتار کار سست اور دوسری کی تیز ہوتی جاتی ہے ۔ اسی تدریج کی وجہ سے ایک دفعہ اقتدار پالینے والی جماعت کو مدت تک جمی جانے کا موقع ملتا ہے ۔ کیونکہ تدریج کائناتی اور حیاتی اور اخلاقی سبھی قسم کے تغیرات کا مستقل خاصہ ہے ۔

پس انتفاع پیشہ جماعت کا اقتدار کچھ اس طرح تحلیل ہوا کرتا ہے :-

قرنِ اول :- قوتِ رضا (۱۰۰) - قوتِ مزاحمت (۱۰) = حقِ اقتدار (۹۰)

قرنِ ثانی :- " (۸۰) " = (۳۰) " " (۵۰)

قرنِ ثالث :- " (۴۵) " = (۳۸) " " (۷)

قرنِ رابع :- " (۴۰) " = (۴۰) " " (۰)

قوتِ رضا اور قوتِ مزاحمت جب برابر ہو جاتی ہیں تو کسی جماعت کے لیے اقتدار کو قائم رکھنا ناممکن ہو جاتا ہے ۔

اوپر نظامِ انتفاع کی جو ساحرانہ شکل بیان ہوئی ہے وہ اس صورت میں نمودار ہوتی ہے جبکہ ایک جماعت اپنی دعوت کے

مخاطبین ہی کے حلقہ میں ایک طرف "خدمت" کا طریق کار اختیار کرے اور دوسری طرف استفاع کا۔ اس کی مثال دیکھنے کو سرمایہ دار ممالک کے نظاموں پر نظر ڈالیے۔ انگلستان، امریکہ، فرانس وغیرہ کی برسرِ اقتدار اجتماعی ہیئتیں اپنی اپنی جغرافی قوموں کو بحیثیت مجموعی دعوت کا مخاطب بنانے پر مجبور ہیں مگر اپنے جانبدارانہ رجحانات کے ماتحت اپنی پوری قوم کے مفاد کی عادلانہ خدمت کی جگہ وہ اس کے سرمایہ دار عناصر کی خدمت کرتی ہیں اور ان کی خاطر محنت پیشہ عناصر کو استفاع کے شکنجہ میں کستی ہیں۔ اب اس دوعملی کے دوہرے اثرات یہ رونما ہوتے ہیں کہ ادھر سرمایہ دار عنصر اپنی نمائندہ مقتدر جماعت کی پشت پناہی کرتے ہیں اور ادھر محنت پیشہ عناصر اس کے خلاف زور کرتے ہیں۔ قانون فطرت کے ماتحت تدریجاً ان ظالمانہ اقتداروں کی پشت پناہی کرنے والی طاقتیں کمزور ہو رہی ہیں اور ان کی مزاحمت کرنے والے عناصر قوت پکڑ رہے ہیں اور اس تغیر کا انجام ایک دن یہ ہوگا کہ جو قوی ہیں وہ کمزور ہو جائیں گے اور جو مظلوم ہیں ابھر کر اوپر آ جائیں گے۔

نظام استفاع جب اپنے مخصوص مخاطبین کے حلقہ سے باہر کام کرنا چاہتا ہے تو پھر وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ کہاں کس ملک یا قوم میں ایسا اقتدار پایا جاتا ہے جو اخلاقی یا مادی وجوہ سے ضعیف واقع ہوا ہو۔ جب کوئی ایسا شکار زد پہ آتا ہے تو کوئی استفاع پیشہ قومی ہیئت "ساحری" کا دام بچھاتی ہے اور اس کے ساتھ "قاہری" کے اسلحہ تیز کرتی ہے۔ آخر بدقسمت قومیں بے بس ہو کے رہ جاتی ہیں۔ اسی صورت حال پر اقبال نے کہا تھا:۔

"غضب ہے نوعِ انساں نوعِ انساں کی شکاری ہے"

گرہیاں بھی مظلوموں کی طرف سے مزاحمت ہونے لگتی ہے۔ اس وقت تک کہ سیاسی ظلم کا خاتمہ ہو جائے۔ اور اس میں جو دیر لگتی ہے وہ قانونِ تدریج ہی کے ماتحت لگتی ہے۔

اس امر کا خیال رہے کہ نظام استفاع کے ماتحت جس عنصر کی خدمت ہوتی ہے وہ بھی دراصل آسائشوں اور لذتوں کے حصول کے باوجود "اطمینان آمیز مسرت" سے محروم رہتا ہے کیونکہ نظام استفاع کے ماتحت ایک قوم کے طبقات میں یا مختلف اقوام میں جو مزاحمت و کشمکش جاری رہتی ہے وہ اطمینان آمیز مسرت کی دشمن ہے۔ اور پھر آخری انجام تو ہمیشہ آنکھیں دکھا دکھا کر انھیں خوفزدہ رکھتا ہے ـــــ یعنی جنگ یا انقلاب! ـــــ جس کا عمل یہ ہے کہ نیچے والوں کو اوپر اور اوپر والوں کو نیچے کر دے!

"رضا" و "مزاحمت" کی آویزش | یہ تسلط ہے کہ نظام استفاع کے ماتحت جو غالب فریق نفع میں رہتا ہے اس کے خلاف گھاٹے میں رہنے والے مظلوم عناصر زور کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی ہمارا یہ دعویٰ کہ مظلوم عناصر آخرکار اوپر آ جاتے ہیں، غور طلب ہے۔ کیا تعجب کا مقام نہیں ہے کہ غالب فریق جو سیاسی اقتدار کی پشت پناہی حاصل کیے ہوئے ہوتا ہے وہ ان نہتے گروہوں سے شکست کھا جائے جنھیں نہ اس کی سی علمی برتری حاصل ہے۔ نہ اس کی سی مالی قوت میسر ہے، نہ اس کی سی مضبوط تنظیم کرنے کا ڈھنگ آتا ہے، نہ اس کی سی سیاسی فوقیت قسمت میں ہوتی ہے۔ لیکن دراصل یہ تعجب کا مقام نہیں ہے، یہ تعجب کا مقام اس لیے بن گیا ہے کہ ہم نے اس غلط فہمی کو حقیقت کا درجہ دے کر حالات کا مطالعہ کیا ہے کہ قوت صرف مادی، سیاسی اور علمی وسائل کا نام ہے اور اخلاق نہ کوئی قوت ہے، نہ اسے ارتقائے حیات میں کوئی دخل ہے۔

دراصل ظلم پر فطرتِ انسانی کبھی مطمئن نہیں ہو سکتی۔ حتیٰ کہ خود ظالم بھی جسے دوسروں کو مظلوم بنا رکھنے سے براہ راست

فائدہ حاصل ہوتا ہے، اس کا ضمیر بھی نظامِ ظلم کے خلاف دبی دبی نفرت کرتا ہے اور اس کی اخلاقیت، چاہے کتنی ہی ضعیف ہو رہی ہو، بہر حال ظلم کے خلاف زور کرتی ہے۔ اب جب نظامِ انتفاع کے حامیوں اور اس کے دشمنوں میں تصادم ہوتا ہے تو اول الذکر گروہ کے پاس مادی قوت تو ہوتی ہے مگر اخلاقی قوت صفر ہوتی ہے، دوسری طرف موخر الذکر گروہ کے پاس مادی قوت نہیں ہوتی مگر اخلاقی قوت ہوتی ہے۔ مادیت اور اخلاقیت کے اس تصادم میں ظالم طبقہ کے بیدار ضمیر افراد کے دل خود بخود ٹوٹ ٹوٹ کر مظلوموں کے ساتھ ہونے لگتے ہیں اور وہ اخلاقیت کے ہر بلہ کے بعد اپنے مقامِ کبریائی سے کچھ نہ کچھ پھسل جاتے ہیں۔ اس طرح تاریخ میں تدریجاً عظیم الشان سیاسی تغیرات رونما ہوتے ہیں۔

مادیت اور اخلاقیت کے تصادم کی تاریخ کا کوئی سا صفحہ بھی کھول کر دیکھ لو، اخلاقیت کو اپنے مقام پر اٹل پاؤ گے، چاہے اس کے حامیوں پر کتنے ہی ظلم توڑے جائیں، مگر دوسری طرف اخلاقیت کے مقابلہ میں مادی قوت کے علمبرداروں کو ہمیشہ اپنی جگہ سے سرکتا ہوا دیکھو گے، چاہے اس کا اقتدار مظلوموں پر کتنی ہی قاہرانہ گرفت کیوں نہ رکھتا ہو۔

حضرت عیسیٰ اور کبرائے یہود، حضرت موسیٰ اور اقتدارِ فرعون، محمد صلعم اور قریش، سیدنا حسین اور یزید، خلیفہ منصور اور علمائے حق، ان میں سے کسی کے تصادم کی داستان پڑھ جاؤ، ظلم اربابِ حق کی جان لے سکا ہے مگر انھیں ان کے موقف سے سرکا نہیں سکا، بلکہ الٹا انسانی خون کی ندیاں بہانے کی قدرت رکھنے کے باوجود آخر کار خائب و خاسر ہو کے رہا۔ نہتے اور بے وسیلہ لوگ محض اخلاقیت کے زور سے اوپر ابھر آئے ہیں اور زر و جواہر اور تخت و تاج اور افواج و عساکر رکھنے والے اکابرِ زمانہ کے پاؤں کے نیچے سے سرک گئے ہیں۔

یہ تو پرانی کہانیاں ہیں، نئی داستانیں جو آپ کے سامنے لکھی گئیں اور لکھی جا رہی ہیں، یہ سب اخلاقیت اور حق و عدل کی قوت کا راز کھولنے والی ہیں۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ مصر اور برطانیہ کی سیاسی کشمکش میں کمزور مصر کامیاب رہا ہے اور قوی برطانیہ اپنے مقامِ اقتدار سے پسپا ہوا ہے؟ کیا یہ حق نہیں ہے کہ زارِ روس کی خدائی کا گلا اس بے بس رعایا نے گھونٹ دیا جس کی بے بسی کو انتہا تک پہنچانے کے لیے سائبیریا کی جہنم کی ساری عقوبتیں اس پر حملہ آور ہو گئیں، پھانسیوں کے پھندے اس کی گردنوں میں حائل ہو گئے، زندانوں نے اسے نگلنا شروع کر دیا، زنجیروں کے اژدہاؤں نے اس کی ٹانگوں کو لپٹنے میں پورے کمالات دکھائے مگر پھر بھی یہی بے بس رعایا غالب رہی۔

پھر جہاں اس نوعیت کا تصادم ابھی تک جاری ہے وہاں بھی آپ یہی صورت حالات دیکھیں گے۔ کیا یہ درست نہیں کہ فلسطین کو مغربی قاہری اس کی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں سرکا سکی بلکہ خود اس قاہری کے لیے راتوں کی نیند اور دنوں کا چین حرام ہو گیا ہے؟ کیا یہ حق نہیں کہ ہندوستان کے مطالبۂ آزادی و استقلال کو موت اور قید، اور بندوقیں اور سنگینیں اور بھوک اور قرقیاں دبا دینے میں ناکام رہی ہیں، بلکہ الٹا کمزور ہندوستانیوں کو برسرِ حق ہونے کی وجہ سے صاحبِ اقتدار برطانیہ ہر آویزش کے بعد ان کے حق کی کچھ نہ کچھ قسط ادا کرنے پر مجبور ہوا ہے؟

انسانی دنیا کا سرا سر مادیت پر انحصار، اور اخلاقیت سے قطعی خالی ہو جانا ناممکن التصور ہے۔ اس کی روحانی توجیہ تو یہ ہے کہ اخلاقیت انسانی فطرت کے اٹل مطالبات کا نتیجہ ہے مگر اس کی مادی توجیہ بھی کی جا سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں اقتدار

ایک ہی ایک نوبت نہیں، متعدد اقتدار بہ یک وقت موجود ہیں۔ اس وجہ سے کسی اقتدار کا معاملہ اپنے محکوموں اور مفتوحوں ہی سے نہیں ہے بلکہ اپنے برابر کے اور اپنے سے قوی تر اقتداروں سے بھی ہے اور ان اقتداروں سے معاملہ کرتے ہوئے وہ خود مجبور ہوتا ہے کہ اخلاقیت ہی کے نام پر حریفوں کو اپیل کرے، حتیٰ کہ جنگ اور معاشی تصادم جیسے غیر اخلاقی سمجھے جانے والے مسائل میں بھی اسے اخلاقیت کا دامن قطعی طور پر چھوڑ دینے کی ہمت نہیں پڑتی۔ اب ایک اقتدار جس حق اور جس عدل کا نام لے کر اپنے ہمسر حریفوں سے امور متنازعہ کو طے کرتا ہے، جب اس کے محکوم و مظلوم اسی حق اور اسی عدل کا نام لے کر اس سے اپنے مطالبات منوانا چاہتے ہیں تو وہ اس سے کامل روگردانی نہیں کر سکتا کیونکہ اس روگردانی سے حق اور عدل کی قیمت کو وہ جتنا گرائے گا، اتنا ہی اپنا نقصان کرے گا۔ جس سکّے کو وہ دوسروں کے سامنے پیش کرکے زیادہ سے زیادہ مطلوبات حاصل کرنا چاہتا ہے، اگر اسی سکّہ کو قبول کرکے وہ خود مطالبات حق و عدل کو ادنیٰ درجہ میں بھی پورا کرنے سے انکار کر دے تو آخر وہ کس منہ سے اور کس امید پر اسی سکّہ کو لے کر باہر جائے گا۔ اخلاقیت کے سکّوں کی جو قدر خود اس کی اپنی منڈی میں قرار پائے گی، بیرونی منڈیاں اسی کی مناسبت سے اس کی قیمت متعین کریں گی۔ چنانچہ آپ نے دیکھا کہ حالیہ جنگ عالمگیر میں جو بڑی بڑی سلطنتیں اس دعوے کے ساتھ میدان میں اتریں کہ ہم محکوموں کو حق آزادی دلوانے کے لیے اور جمہوریت و مساوات قائم کرنے کے لیے لڑائی لڑتی ہیں، پس دنیا کو ہماری امداد کے لیے پورے ذرائع صرف کر دینے چاہییں، کیا ان سلطنتوں سے ان کے ایک ایک مخالف ایک ایک معاون نے یہ سوال پیش نہیں کیا کہ تم جو فلاں ملک کو غلام بنائے ہوئے ہو اور تم جو فلاں قوم کا خون چوس رہے ہو، تم پر کیسے بھروسہ کیا جا سکتا ہے کہ تم آزادی اور مساوات اور جمہوریت کے نفاذ کے لیے تلوار اٹھا رہی ہو؟ —— اور کیا یہ واقعہ نہیں کہ ان طاقتوں کو اپنے محکوموں کے مقابلہ میں نرم ہونا پڑا؟

نظامِ ظلم و انتفاع کے ماتحت تدریجاً ارباب اقتدار کی رضا میں ضعف اور مظلوموں کی مزاحمت میں شدت پیدا ہونے کی بھی مادی توجیہ ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ جب کسی سوسائٹی کا مجموعی نظم ظالمانہ ہوتا ہے تو پھر اس کے اندر ایک ایک گوشے میں ظلم ہی کو فروغ ملنے لگتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جب انتفاع کو کارِ خیر مان لیا گیا ہو تو یہ ممکن نہیں کہ اس کا ایک خاص دائرہ متعین رہے۔ یہ دائرہ لازماً پھیلے گا۔ مثلاً کسی متعدد سرمایہ دار عنصر سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ملک کے محنت پیشہ عنصر کی ایک مقررہ تعداد کا خون نچوڑتا رہے، بلکہ اس کی کوشش یہ رہتی ہے کہ اس ریوڑ میں خوب ترقی ہو اور نئے نئے موٹے تازے جانور اس میں بھرتی ہوتے رہیں۔ چنانچہ بڑے سرمایہ دار چھوٹے سرمایہ داروں کو رفتہ رفتہ اس ریوڑ میں شامل کرتے جاتے ہیں تاآنکہ ایک بالکل قلیل عنصر ظالموں کا رہ جاتا ہے اور مظلوموں کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ ظلم کے اسی عمل کو معاشیات میں "تمرکزِ زر" کی اصطلاح سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ اصول صرف معاشیات ہی میں نہیں، ہر دائرہ میں چلتا ہے۔ فرض کیجیے کہ آدم خوری کو جائز قرار دے دیا جائے اور انسان انسانی گوشت کو غذا میں شامل کر لے۔ اور قانون کی طرف سے عام اجازت ہو کہ آدمی کا شکار کیا جا سکتا ہے۔ اب جن جن لوگوں کو اچھی اچھی انقلیں حاصل ہیں وہ نتھنوں کو بھون بھون کر کھاتے پھریں گے، مگر بات نتھنوں تک محدود نہیں رہ سکتی،

آخر کار خود ان رائفلوں والوں میں آدم شکاری کا معرکہ شروع ہوگا، اچھی رائفل والا نشانہ کا ماہر، ردّی رائفل والے اور نشانہ میں کمزور رہنے والے حریف کو بھون بھون کر کھا جائے گا۔ آخر کار سب کا صفایا ہو جائیگا۔
بالکل اسی طرح یہ دنیا کی سیاست چلتی ہے۔ پوری دنیا کی کمزور اقوام کے مقابلہ میں مقتدر اقوام کا ایک گروہ ہے جو ایک دوسرے کی رسمی پاسداری اور باہمی معاہدات وغیرہ کی وجہ سے ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے بنی ہوئی ہیں۔ مگر خود ان کے درمیان بھی ضعف و قوت کی معرکہ آرائی برسرِ کار ہے، چنانچہ ان میں سے بعض اقوام سربراہ کاری کرتی ہیں، جیسے آجکل "تین بڑوں" کی بڑائی کے مظاہرے ہو رہے ہیں، مگر خود ان سربراہ کاروں میں بھی دبی دبی آویزش موجود ہے۔ اس آویزش میں جب ایک قوم کا پلڑا بھاری قرار دیا جائے اسے اگر گہری نظر سے دیکھیے تو اس کے اندرونی طبقات میں وہی تصادم موجود ہے، پھر ان طبقات کے اندر بھی مختلف پارٹیوں میں رسہ کشی ہوتی ہے، اور پارٹیوں کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ فرد فرد میں بھی وہی مسابقت ہے اور ہر ایک یہی چاہتا ہے کہ دوسروں کو بیچ کھائے۔

پس نظامِ انتفاع کے اندر خود ظالم عنصر کی مختلف پارٹیوں میں اور ان پارٹیوں کے افراد کے درمیان بھی یہی مسابقت جاری رہتی ہے کہ اوپر ہم ہی ہم ہوں، باقی سب نیچے ہو کے رہیں اور اس عمل کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ظالم عنصر کے سکڑتے جانے سے نظامِ انتفاع کو جدھر سے معاونت حاصل تھی اُدھر کمزوری پیدا ہونے لگتی ہے اور مظلوموں کی تعداد میں اضافہ ہونے سے مزاحمت میں شدت آنے لگتی ہے اور اس کے نتیجہ میں کوئی انقلابی تحریک کامیاب ہو سکتی ہے۔

کیا آپ کے دل میں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ مظلوم جب نظامِ انتفاع کے خلاف چیخ پکار کر کے اخلاقی دباؤ پیدا کر لیتے ہیں تو آخر ظالم عناصر بھی کیوں نہیں برسرِ عام چیخنے کہ دیکھو یہ لوگ ہمیں راحتوں اور آسائشوں سے محروم کرنا چاہتے ہیں، اور کیوں اس شور پر انھیں اخلاقی زور نہیں حاصل ہو جاتا؟ اگر ہندوستانی چلا سکتے ہیں کہ انگریز ہمیں لوٹ کر کھا گئے تو انگریز کیوں نہیں چلاتا کہ دیکھو ہندوستانی ہمارا اقتدار ختم کر کے ہمیں ان فائدوں سے محروم کر رہے ہیں جو ان کی غلامی سے ہمیں حاصل ہو رہا ہے؟ ہمارے کارخانے تباہ ہو جائیں گے، ہمارے بہت سے لوگوں کی تنخواہیں اور پنشنیں بند ہو جائیں گی، ہماری تجارت کے لئے منڈیاں نہ رہیں گی وغیرہ؟ مزدور اگر یہ فریاد کر کے اخلاقی زور پیدا کر لیتا ہے کہ سرمایہ دار میرا مال مار رہا ہے تو سرمایہ دار کیوں نہیں انسانیت سے اپیل کرتا کہ دیکھو مزدور مجھے اپنا خون نہیں چوسنے دیتے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ میری توند اتنی پھولی نہ رہ سکے گی؟ کالی چمڑی والا حبشی اگر گوروں کے مظالم بیان کر کے ہمدردیاں حاصل کر سکتا ہے تو گورے کیوں انسانی جذبات کو اپیل کر کے ہمدردیاں نہیں حاصل کر سکتے کہ دیکھو یہ کالی نسل ہماری برابری کر کے ہمارا رتبہ گھٹا رہی ہے؟ اسی سوال کے حل سے تو وہ عظیم الشان راز کھلتا ہے جس سے مغرب چشم پوشی کرتی ہے۔

دراصل "قوت" کے استعمال سے انتفاع کرنے اور دوسروں کو گرا کر خود کو اوپر اٹھانے کے خلاف انسانیت کی مزاحمت بالکل ایک ایسے قانون کے مطابق ہے جو طبعی قوانین کی طرح اجتماعیات میں نافذ ہے، بلکہ غلط نہ ہوگا اگر اسے "اجتماعی طبعی قانون" کہا جائے۔ نظامِ انتفاع انسانوں کی حسِ اخلاقی کو کبھی اپیل نہیں کر سکتا بلکہ وہ فطرتِ انسانی کے خلاف

چلنے کی وجہ سے مجبور ہوتا ہے کہ انسانی اخلاقیت کو دبانے کے لیے مادی قوت کو استعمال کرے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ پانی کو نشیب کی طرف بہنے کے لیے کسی خارجی قوت کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس کی یہ حرکت عین طبیعی قانون کے ماتحت ہے مگر آپ اگر اسے اس قانون کے خلاف بلندی کی طرف لے جانا چاہیں تو آپ مجبور ہوں گے کہ کوئی خارجی قوت اس پر صرف کریں۔ مثلاً کنویں سے پانی کھینچنا ہے تو رہٹ یا پمپ یا کوئی اور آلہ یا مشین استعمال کی جائے گی اور اس پر قوت صرف ہوگی۔ جسمانی قوت ہو یا تیل کی قوت، بھاپ کی قوت ہو یا برقی قوت! صرف قوت کے بغیر پانی کو ایک مصنوعی راستہ پر چلانا ممکن نہیں ہے۔

اجتماعیات میں بھی یہی اصول کام کرتا ہے۔ نظام اجتماعی اگر انسانی سوسائٹی کو انسانی فطرت پر برقرار رکھے گا اور اسی کے تقاضے سے نظامِ حق و عدل کو کار فرما کرے گا تو اس کی مزاحمت نہیں ہوگی اور اس وجہ سے مزاحمت کا زور روکنے کے لیے اسے فضول قوت صرف کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے گی لیکن جب وہ خلافِ قوانینِ فطرت حرکت کرے گا تو قوت صرف کیے بغیر کوئی چارہ نہ ہوگا۔

آپ موجودہ سوسائٹیوں پر اگر غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ انسانی فطرت کی متعین راہِ حق و عدل سے اقتداروں کے ہٹ جانے کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ بے شمار انسانی قوت ضائع ہو جاتی ہے۔ مزدور اور سرمایہ دار کا تصادم ہو یا کالی اور سفید نسلوں کی کشمکش، عورتوں اور مردوں کی آویزش ہو یا والدین اور اولادوں کی رسہ کشی، طبقوں طبقوں کی فساد انگیزیاں ہوں یا قوموں قوموں کی کشتم کشتا، ان سارے دنگلوں پر بے حساب اجتماعی قوت ضائع ہوتی ہے۔ معاشرت میں ظلم کی کارفرمائی ہو تو خاندانی قوت کا ضیاع ناگزیر ہے، کیونکہ ماں باپ اور اولاد، بیویاں اور شوہر، ایک دوسرے کے سکون کو تہ و بالا کرنے کے لیے زور کرتے رہیں گے۔ معیشت میں اگر ظلم گھس جائے تو سرمایہ اور محنت دونوں کا بہت بڑا حصہ باہمی آویزش کی وجہ سے ضائع جاتا ہے۔ سیاست میں اگر فساد کا دخل ہو تو جماعتوں اور پارٹیوں اور لیڈروں اور صحافیوں اور مفکروں کی آویزش میں طاقت کی بہت بڑی مقدار رائیگاں جاتی ہے۔ عام معاملات میں اگر حق و عدل کی نفی ہونے لگتی ہے تو افراد کی کھینچا تانی میں بہت سی انفرادی قابلیتیں دم توڑ دیتی ہیں۔ اگر آپ کے پاس وسیع ذرائع ہوں اور باریک بینی سے آپ دنیا بھر کی فوجی، عدالتی، تمدنی، علمی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، اور انفرادی قوتوں کے ضیاع کا کامل اندازہ لگا سکیں تو آپ دیکھیں گے کہ انسانی مساعی کا ننانوے فیصد حصہ محض ظلم و فساد کے خلاف جو مزاحمت ہوتی ہے اسے روکنے میں ضائع جاتا ہے۔

اب ذرا گذشتہ سطور کا خلاصہ پیش نظر رکھ لیجیے تاکہ آپ بسہولت کسی نتیجہ پر پہنچ سکیں۔

۱۔ کوئی نظام اجتماعی انسانی رضا کے بغیر نہیں چل سکتا۔

۲۔ نظام خدمت کو انسانی رضا حاصل ہوتی ہے۔

۳۔ نظام انتفاع جس عنصر کی خدمت کرتا ہے، اس کی رضا اسے حاصل ہو جاتی ہے ـــــ مگر جس عنصر پر ظلم ہوتا ہے وہ اس کی مزاحمت کرتا ہے۔

۴۔ نظام انتفاع کی تائید میں ارباب ظلم کا زور مادی قوت رکھنے کے باوجود تدریجاً کم ہوتا جاتا ہے اور دوسری طرف مظلوموں کی مزاحمت کا زور مادی قوت سے محروم ہونے کے باوجود تدریجاً بڑھتا جاتا ہے، تاآنکہ نظام انتفاع کا خاتمہ ہو جائے۔

۵۔ نظامِ انتفاع (ظلم) کو سوسائٹی میں بحال رکھنے کے لیے بہت سی انسانی قوت رائگاں جاتی ہے۔

ان نکات پر غور کرنے کے بعد ہر سلیم الفطرت آدمی لازماً اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ نظامِ انتفاع (ظلم و باطل) انسانی فطرت کے ساتھ کوئی مطابقت نہیں رکھتا اور برعکس اس کے نظامِ خدمت (حق و عدل) انسانی فطرت و طبیعت سے موافقت رکھنے کی وجہ سے پوری کامیابی سے پروان چڑھ سکتا ہے اور اسی کے اختیار کرنے سے جماعتوں میں الفت نمودار ہوتی ہے۔

مگر نہیں، ابھی ہمیں اس دعوی کے دلائل کو قوی تر کرنا ہے اور اجتماعیات میں فطرت کے جو طبیعی اخلاقی ضوابط برسرِ عمل ہیں ان کی توضیح کی ضرورت ہے۔

(باقی آئندہ)

اشتراکی مغالطے

از جناب مولوی محمد مظہر الدین صاحب صدیقی

(یہ ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے جو صاحب مضمون کے مزید اضافے اور تشریحات کے بعد شائع کیا جا رہا ہے)

اشتراکیوں کا خیال ہے کہ کسی نظامِ فکر کے مختلف اجزائے ترکیبی کا باہمی ربط و تطابق اُس کی صداقت کا معیار ہوا کرتا ہے۔ انھیں اس بات پر فخر ہے کہ اشتراکیت عقائد و نظریات کا ایک مربوط نظام ہے جس کا ہر جزُ دوسرے جزُ سے ہم رشتہ اور ہم آہنگ ہے۔ لیکن جس شخص میں ذکاوتِ طبع کا ذرا سا بھی مادہ موجود ہے، وہ اشتراکی نظام فکر میں متعدد رخنوں کا سراغ لگا سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ اشتراکیوں کی طرح معاشرتی اور اقتصادی تعصبات سے مغلوب نہ ہو۔ علاوہ ازیں اگر اس اشتراکی دعوے کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اشتراکی نظامِ فکر کے ترکیبی عناصر ایک داخلی ربط و تسلسل کے حامل ہیں، تب بھی محض یہ چیز اشتراکیت کے برحق ہونے کا کافی ثبوت نہیں ہو سکتی ہے۔ کیونکہ کسی نظام کے اجزائے فکر کی باہمی مطابقت صداقت کا واحد معیار نہیں ہے۔ اگر کسی شخص کی دروغ بانیوں میں داخلی ربط و تسلسل پایا جائے تو محض اس ربط کی بنا پر اس کی دروغ بیانیاں بجا بیاں نہیں بن جائیں گی۔

تاہم جہاں تک داخلی ربط اور تطابقِ فکر کا سوال ہے، اس پہلو سے بھی اشتراکیت علمی تنقید کی تحمل نہیں ہو سکتی ہے مثال کے طور پر تاریخ کی مادی تعبیر کو لیجیے، جو قصرِ اشتراکیت کا سنگ بنیاد ہے۔ اشتراکی کہتے ہیں کہ تمام اخلاقی تصورات اور علمی نظریات زندگی کے معاشرتی ماحول اور خارجی واقعات سے پیدا ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اخلاقی افکار اور ذہنی تخیلات ان خارجی حالات سے الگ ہو کر کوئی حیثیت نہیں رکھتے، جن میں کہ وہ رونما ہوتے ہیں۔ اس مفروضہ کی بنا پر تمام صداقتیں اپنے اپنے دور کے لحاظ سے اضافی قرار پاتی ہیں۔ یعنی ہر صداقت جس دور کے خارجی حالات سے وجود پذیر ہوتی ہے۔ اس دور کے ختم ہو جانے پر ساقط الاعتبار ہو جاتی ہے۔ ایسی کوئی صداقت نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے جو ہر زمانہ کے لیے یکساں طور پر صحیح ہو اور ابدی ہونے کا دعویٰ کر سکے۔ اب اگر اشتراکیوں کا یہ نظریہ تسلیم کر لیا جائے کہ انسانی افکار و تخیلات اور اخلاقی اقدار (Moral Values) خارجی احوال و واقعات کا عکس ہوتے ہیں۔ تو یہ بات مطلق سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ افکار و اقدار پر نیک و بد، محمود و مذموم یا حق و باطل ہونے کا اطلاق کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ جو چیز خارجی حالات سے میکانکی طور پر پیدا ہو جاتی ہے اور ہمارے ارادہ و اختیار کے بغیر ہم پر زندگی بجبر مسلط ہے وہ بری یا اچھی کیسے کہلائی جا سکتی ہے۔ روحانی تصورات اور اخلاقی افکار بے نتیجہ اور بے قیمت ہیں اگر وہ ہماری مادی زندگی اور خارجی ماحول سے میکانکی طریقہ پر وجود میں آتے ہیں۔ کیونکہ ایسی صورت میں ہماری عملی زندگی سے ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا ہے اور نہ واقعات و حوادث کی تشکیل یا انسانی اعمال کی صورت گری میں ان کا کوئی حصہ ہو سکتا ہے۔ جس طرح ہم اپنے گرد و پیش اور اپنے خارجی ماحول کے اثرات سے بچ نہیں سکتے ہیں۔ اسی طرح ہم اپنے عقائد

وانکار اور اخلاقی تصورات پر عمل پیرا ہونے کے لیے بھی مجبور ہیں۔ کیونکہ وہ بھی ہمارے خارج اور ہمارے گردوپیش سے وجود میں آتے ہیں۔ اس مفروضہ پر اخلاقی تصورات و اقدار کا وجود تو تسلیم کیا جاسکتا ہے لیکن اُن کی اخلاقی اور عملی قدر و قیمت کا انکار لازم آتا ہے۔ نیز اس استدلال کی بنا پر ہر قسم کے معاشرتی مظالم، سیاسی جبر اور معاشی استحصال کو جائز ٹھیرایا جاسکتا ہے۔ اگر انسان خارجی احوال اور گردوپیش کے اثرات کا مجبور بندہ ہے اور اس کی ذہنیت و سیرت بالکلیہ خارجی اثرات سے تشکیل پاتی ہے، جن پر اسے کسی طرح کا اختیار یا قدرت نہیں ہے۔ تو پھر سرمایہ دار اپنی معاشی لوٹ کھسوٹ، سامراج کے نمائندے اپنے سیاسی ظلم وستم اور فاسسٹی آمر اپنے جابرانہ طرزِ حکومت پر اسی طرح مجبور ہیں جس طرح اشتراکی حضرات اپنی انقلاب انگیزی اور مفسدہ پردازی پر اور حیوانات اپنی بہیمانہ سرشت پر۔ کائنات کا ہر ذرہ مقہور و مجبور ہے اور انسانی ارادہ و اختیار ایک زعم باطل ہے۔ جب ہر طبقہ اور ہر گروہ خارج کا بے بس آلۂ کار ٹھیرا تو اس کی برائیوں اور ناانصافیوں کی ذمہ داری اس پر کیونکر عائد کی جاسکتی ہے۔ یہ سارا ظلم و فساد اس عمل ارتقاء (Evolutionary process) اور تاریخی وجوب (Historical Necessity) کے تحت رونما ہو رہا ہے جس کے نام پر اشتراکی حضرات اپنی تحریک چلا رہے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر اشتراکی تحریک کامیاب بھی ہو جائے تو اس کی کامیابی حق و صداقت کی کامیابی نہیں بلکہ زور و قوت کی کامیابی ہو گی۔ کیونکہ حق و صداقت کا اطلاق ان اعمال و افکار پر نہیں کیا جاسکتا ہے جو انسان سے اضطراراً بلا اختیار و ارادہ اور خارجی ماحول کے دباؤ سے سرزد ہوں۔ خیر و شر اور حق و باطل کے تصورات انسانی اختیار اور ارادہ کے وجود کو مستلزم ہیں۔ جو انسان خارجی ماحول اور ارتقائی عمل کا غلام ہو اس کے لیے نہ حق و صداقت کوئی چیز ہو سکتی ہے اور نہ عدل و انصاف کوئی معنی رکھتا ہے۔ جو کچھ ہے، ہے، خواہ وہ ظلم ہو یا عدل، مساوات ہو یا نامساوات۔ اس کے سوا نہ کچھ ہو سکتا ہے اور نہ ہو سکتا تھا۔ انسانی تاریخ میں وجوب (necessity) ہی وجوب ہے۔ امکان (possibility) کا نام نہیں ہے۔

اب آئیے ذرا دیر کے لیے ہم اس نظریے کو خود تاریخ کی مادی تعبیر پر چسپاں کر کے دیکھیں۔ دعویٰ یہ ہے کہ انسانی افکار و تخیلات اور علمی نظریات معاشرتی ماحول اور خارجی احوال سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور ان کی صداقت اس معنی کر کے اضافی ہوتی ہے کہ جب وہ دور ختم ہو جاتا ہے جس کے مادی اور معاشرتی احوال نے ان نظریات و افکار کو پیدا کیا تھا، تو ان افکار و نظریات کی صداقت اور سودمندی بھی ضائع ہو جاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ تاریخ کا مادی نظریہ یعنی یہ دعویٰ کہ افکار و نظریات خارجی ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں، کن خارجی حالات اور کس معاشرتی ماحول میں پیدا ہوا تھا۔ مفروضہ بالا کے تحت تاریخ کی مادی تعبیر کا یہ نظریہ اُن احوال خارجی اور اس سیاسی اور معاشرتی ماحول سے پیدا ہوا تھا جس میں مارکس اور انجلیس نے زندگی بسر کی اور جس میں اُن کی ذہنی نشوونما ہوئی۔ چونکہ اُس زمانے کے خارجی حالات اِس وقت موجود نہیں ہیں اور کارل مارکس کے عہد سے دو تین صدی پیشتر یقیناً ان حالات کا کوئی وجود نہ تھا۔ اس لیے اس مفروضہ اور اس نظریے کی بنا پر ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ عہد مذکور یعنی انیسویں صدی کے قبل اور اس کے بعد جو واقعات پیش آئے ان کی تعبیر اس طرح نہیں کی جاسکتی ہے جس طرح اشتراکی حضرات ان کی عموماً تعبیر کیا کرتے ہیں۔ تاریخی واقعات کی توجیہ کا یہ طریقہ صرف انیسویں صدی کے لیے صحیح ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اسی صدی کے سیاسی اور معاشی حالات اس علمی نظریہ کی پیدائش کا سبب ہوئے تھے۔ اور اب جب کہ وہ حالات ختم ہو چکے ہیں، اس نظریہ کی صداقت بھی ساقط ہو گئی ہے۔ ماضی اور حال کے جملہ واقعات کی تعبیر و توجیہ اس نقطۂ نظر سے کرنا خود مارکس کے اس بنیادی مفروضہ پر ظلم کرنا ہو گا کہ علمی نظریات اور

اخلاقی تصورات خارجی ماحول کا عکس ہوا کرتے ہیں۔ اس کے باوجود اشتراکی حضرات قدیم اور جدید تاریخ کی توجیہ اسی مادی نقطۂ نظر سے کرتے ہیں جو صرف اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے حالات سے وجود پذیر ہوا تھا۔ یہ عقیدہ رکھنے کے باوجود کہ کوئی صداقت ابدی اور عالمگیر نہیں ہے وہ تاریخ کی مادی تعبیر کو ایک عالمگیر اور ابدی صداقت کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں اور تاریخ کے ہر دور پر اس کو بلا تکلف چسپاں کر دیتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر تضاد خیال کی اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔

اشتراکیت کے نظریات میں صریح تناقض اور عدم تطابق کا ایک دوسرا ثبوت اس کا وہ رویہ ہے جو اس نے مذہب کے متعلق اختیار کیا ہے۔ اشتراکیت مذہب کی شدید دشمن ہے۔ اشتراکی مفکرین کے نزدیک مذہب ہمیشہ ظالموں اور جفاکاروں کا آلۂ کار رہا ہے۔ اس نے ہمیشہ فرماں روا طبقے کو ظلم و ستم، ناانصافی اور معاشی استحصال میں مدد پہنچائی ہے۔ مذہب ان کے نزدیک عوام الناس کے لیے افیون ہے۔ یہ خیال بنیادی طور پر لغو اور مہمل ہے۔ یا تو اس کے پیش کرنے والے قطعی طور پر مذہب کی تاریخ سے ناواقف ہیں، یا پھر وہ واقعات کی صورت کو اپنی خواہشات کے مطابق عمداً مسخ کر کے غلط طریقے سے پیش کرتے ہیں۔ یہ اشتراکیت پسندوں کا ایک مرغوب مشغلہ ہے۔ پوری تاریخ ان کی اس غلط بیانی کی تردید کرتی ہے۔ تاریخ میں جہاں کہیں کسی دینی تحریک کی ابتدا ہوئی ہے اس نے ہمیشہ مظلوم انسانوں کا ساتھ دیا ہے۔ ظالم، غاصب اور ذاتی اغراض و منافع کو پیش نظر رکھنے والے ہمیشہ مذہب کے شدید ترین دشمن رہے ہیں۔ انبیاء کو جو کفار کی طرف سے ایک عام طعنہ دیا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ دنیوی وجاہت کا مالک کوئی انسان تمہارے ساتھ نہیں ہے، تمہارے متبعین سب کے سب ایسے ہیں جنہیں سوسائٹی میں کوئی قدر و منزلت حاصل نہیں۔ ان کے اندر صحیح قوت فیصلہ ہی موجود نہیں ہے۔ قرآن نے انہی کے قول کو اس طرح نقل کیا ہے:-

مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ۔ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ۔

ہم نہیں پاتے تم کو مگر اپنے ہی جیسا انسان اور ہم نہیں دیکھتے کہ تمہاری پیروی کی ہو مگر ان لوگوں کو جو ہم میں کمینے ہیں، بے سمجھے بوجھے اور تم کو ہم پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔

قریش اسی لیے آخر دم تک مسلمانوں سے برسرپیکار رہے کہ اسلام اس معاشرتی اور سیاسی تفوق کو مٹا رہا تھا جو انہیں معاشرے میں حاصل تھا۔ چھٹی صدی عیسوی میں جزیرۃ العرب کے حقوق یافتہ طبقات اسلامی تحریک کی ترقی سے خائف و ہراساں تھے۔ اسلام کی فتح دراصل مساوات کی فتح تھی اور یہی اس کی فوری ترقی اور حیرت انگیز کامرانی کی بہت بڑی وجہ ہے۔ انسان کے لیے افیون ہونا تو درکنار، اسلام تاریخ میں ایک عظیم ترین انقلابی قوت ہے جس کے سامنے فرانسیسی انقلاب یا روس کا اشتراکی انقلاب بالکل ہیچ نظر آتے ہیں۔ روس کا انقلاب ایک ایسے ملک میں برپا ہوا جو آبادی کی کثرت، رقبہ کی وسعت اور قدرتی وسائل کی فراوانی کے لحاظ سے دنیا کے تمام ملکوں پر فائق ہے۔ اس کے باوجود ایک طاقت ور دشمن سے اپنے اولین تصادم کے موقع پر وہ اپنے خول میں سمٹ کر رہ گیا اور اُس کو محض اپنی حفاظت اور بقا کے لیے دوسروں کی مدد کا دست نگر ہونا پڑا۔ لیکن اسلامی تحریک جلد تمدنی موثرات سے دور، ایک خشک، بنجر، بے برگ و گیاہ اور قلیل آبادی رکھنے والے خطۂ زمین سے اٹھی اور فتحمندانہ شان کے ساتھ پھیلتی اور وسیع ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ ہندوستان کی سرحدوں سے لے کر بحر اوقیانوس کے سواحل تک، ایشیاء اور افریقہ کا بیشتر حصہ اس کے حلقۂ اقتدار میں آگیا۔ اور یہ سب کچھ اُس زمانہ میں وقوع پذیر ہوا جب کہ ذرائع آمد و رفت کی رفتار نہایت سست

تھی۔ جب کہ سٹیم انجن اور دخانی جہازوں کا نام ونشان تک نہ تھا۔ موٹر کار اور ہوائی جہاز کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ روسی انقلاب کو اسلامی انقلاب کے مقابلہ میں پیش کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے سورج کو چراغ دکھانا۔ اسلام نے اپنے دائرے میں داخل ہونے والی قوموں کی زندگیوں میں جو عظیم الشان تغیر پیدا کیا اس کا اندازہ کیجیے۔ فارس، مصر، شام اور الجیریا کے دور افتادہ خطوں میں رہنے والوں کو ہمیشہ کے لیے اسلام نے ایک مستقل طرز زندگی عطا کیا۔ گذشتہ بارہ صدیوں کے انقلابات، حتیٰ کہ مغرب کی مادی تہذیب کی نظر فریب نقشہ آرائی بھی اُن کے اخلاقی اقدار او دینی نقطۂ نظر کو تبدیل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ اتنے وسیع الاثر اور دور رس نتائج رکھنے والے انقلاب سے اشتراکی انقلاب کو کیا نسبت ہو سکتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ بسا اوقات معاشی مقاصد کے لیے مذہب کا ناجائز اور ناروا استعمال ہوتا رہا ہے۔ لیکن اس میں مذہب کا کیا قصور ہے؟ افکار و نظریات کا کوئی سا مجموعہ، خواہ وہ دینی ہو یا غیر دینی، پست اور ذلیل مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہی الزام خود اشتراکیوں کے خلاف عائد کیا جا سکتا ہے۔ سوسائٹی کے وہ تمام عناصر جو سماجی اور مذہبی قیود سے آزاد ہونا چاہتے ہیں جن میں متمول طبقوں کے وہ افراد بھی شامل ہیں جو آزادانہ تن پروری اور تعیش پرستی کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں اور وہ تعلیم یافتہ نوجوان بھی شامل ہیں جو کہ ناقص تعلیم و تربیت کی وجہ سے ہر قسم کی اخلاقی بندشوں کو توڑ دینا چاہتے ہیں، اشتراکیت کے علمبردار نظر آتے ہیں۔ اور یہ محض اس لیے کہ اشتراکیت تمام مذہبی اور اخلاقی قیود کی نفی کرتی ہے اور اخلاق کی بنیاد محض مصلحت پرستی پر قائم کرتی ہے۔ اور اشتراکی بنا انفرادی اور شخصی اصلاح کی کوششوں اور اس کی لازمی مشقتوں سے انسان کو رہائی دیتا ہے۔ ان اشتراکیوں کا دعویٰ ہے کہ دنیا کے تمام مفاسد سرمایہ داری کی پیداوار ہیں اور اصلاح نفس کی حقیقت ایک خام خیالی یا خود فریبی سے زیادہ کچھ نہیں۔ جب سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ ہو جائے گا اُس وقت معجزانہ طور پر تمام افلاس، بُرائی اور بے انصافی دنیا سے مٹ جائے گی۔ اشتراکی جنت میں اخلاقی قیود کے آثار باقیہ کو مکمل طور پہ صفحۂ ہستی سے محو کر دیا جائے گا۔ اور انسان کو آزادی اور بے لگامی کی وہ بہشت حاصل ہو جائے گی جس کی نعمتوں سے جنگل کے شیر اور سمندر کی مچھلیاں لذت اندوز ہیں۔ اس طرح اشتراکیت سے دین اور اخلاق کے وہ دشمن ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں جنھیں نیکی سے اس لیے نفرت ہے کہ ان میں نیک اور شریف بننے کی ہمت اور سکت باقی نہیں ہے۔ جو نظام اخلاق سے اس لیے بیزار ہیں کہ وہ قدم قدم پر ان سے اصلاح اخلاق کی دائمی جدوجہد کا مطالبہ کرتا ہے۔

اشتراکیت کے نظریات میں صرف ایک صداقت ہے جو کہ بیک وقت اسکی زندگی اور قوت کا باعث ہے۔ وہ یہ کہ کوئی معاشرہ زندہ نہیں رہ سکتا، ترقی اور ارتقا کا تو ذکر کیا ہے، جو اپنے افراد کی ایک کثیر تعداد کو ان وسائل حیات سے محروم رکھے جن سے کم از کم ایک اوسط درجے کی آسائش کی زندگی بسر کی جا سکے۔ نیز یہ کہ اگر سوسائٹی میں آپ مذہب، اخلاق اور دیگر اعلیٰ اقدار کی کارفرمائی چاہتے ہیں تو آپ کو طبقاتی اقتدار ختم کرنا ہوگا اور ایک ایسے اجتماعی نظام کے قیام کی کوشش کرنی ہوگی جو سوسائٹی کے ہر مرد و زن کے لیے کم از کم وہ ضروریات زندگی فراہم کرنے کا ذمہ لے جن سے جسم و جان کا رابطہ باسانی قائم رکھا جا سکے۔ یہ ایک ایسی صداقت ہے جسے ہر صحت مند اور ترقی پذیر معاشرے نے تسلیم کیا ہے۔ جہاں اسے تسلیم نہیں کیا گیا اس کا نتیجہ باہمی استحصال، ہلاکت اور تباہی کی صورت میں نمودار ہوا ہے۔ سوائے اس ایک نہایت اہم صداقت کے جس کی حامل تنہا اشتراکیت ہی نہیں، تمام فلسفۂ اشتراکیت لغویات کا ایک انبار اور جزوی صداقتوں، غلط بیانیوں اور دروغ گوئیوں کا ایک طوفان ہے جس میں تاریخ انسانی کے واقعات کو مسخ کر کے اور ان میں جا بجا بری طرح قطع و برید کر کے پیش کیا گیا ہے۔

فریضۂ اقامتِ دین

از

جناب مولوی صدرالدین صاحب اصلاحی

کسی با اصول جماعت کی زندگی اس کے اصولوں کی زندگی پر موقوف ہے، اگر اس کے افراد میں ان اصولوں کا سچا عشق اور یقین موجود ہو تو موت اس کو آنکھ نہیں دکھا سکتی، یہ عشق اور یقین اس امر کی ضمانت ہے کہ وہ جماعت دنیا میں ایک غالب، سربلند اور باعزت جماعت کی حیثیت سے بپا ہو کر رہے گی اور پھر اسی عشق و یقین کا فطری تقاضا یہ ہے کہ جماعت کا اجتماعی نظم و نسق اس کے اپنے ہاتھوں میں ہو، وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس صورت حال کو برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی ایسا اجتماعی نظم اس پر مسلط ہو جو اس کے محبوب اصولوں پر تعمیر نہ کیا گیا ہو، اور اگر انقلابی حوادث نے اس کو کبھی یہ دن دکھا دیے تو اس کا ایک ایک فرد اس مچھلی کی طرح بے تاب و بیقرار رہے گا جس کو پانی سے نکال کر خشکی پر ڈال دیا گیا ہو، اس کو اپنے اصولوں کی محبت موت کی بازی کھیلنے پر مجبور کر دے گی، وہ رائج الوقت نظامِ زندگی کے خلاف سراپا احتجاج اور مجسم اعلانِ جنگ بن جائے گا اور اس کے ساتھ کسی قسم کے تعاون یا مصالحت یا مداہنت کا تصور تک اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میری انفرادی اور جماعتی زندگی کا تشخص انہی اصولوں سے وابستہ ہے جن کو اس نظامِ قاہر نے تہ و بالا کر رکھا ہے۔ پھر یقین ہے کہ یہ جماعت کبھی نہ کبھی اس نظامِ غیر کے حلقۂ غلامی کو اپنی گردن سے نکال پھینکے گی، اور اپنے اصولوں کا نظامِ زندگی قائم کر کے دم لے گی، بشرطیکہ اس کی بہ نسبت اس کے اصول زیادہ طاقت اور صداقت کے حامل ہوں اور اس کے پیروؤں کی بہ نسبت اس کے افراد میں اپنے اصولوں کے ساتھ زیادہ گہری عقیدت و فدویت ہو۔

لیکن ایک اجتماعی مسلک رکھنے والی اور با اصول جماعت کے افراد میں اگر کسی دوسرے نظامِ زندگی کے ساتھ، جو ان پر کسی طرح مسلط ہو گیا ہو، تعاون یا مصالحت یا مداہنت کا رجحان پیدا ہو گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ متاعِ حیاتِ قومی کے محافظین نے خزانہ کی کنجیاں دشمنوں کے حوالہ کر دیں اور اب اس متاع کا لٹ جانا چند لمحوں کی بات ہے، جس کو شاید کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہو تو بچا سکے۔

اس کے بعد ایک تیسرا دور بھی آتا ہے جس میں افرادِ جماعت، مداہنت اور تعاون کی حدود سے تجاوز کر کے اس مقام پر جا پہنچتے ہیں جہاں انھیں اپنا اصولی اور اخلاقی موقف ہی یاد نہیں رہ جاتا ہے اور وہ اپنے اصول و مقاصد سے اتنے بیگانہ ہو جاتے ہیں کہ نہ صرف عملاً، اور بطیبِ خاطر، ان اصولوں کی بیخ کنی پر اپنی بہترین قوتیں اور صلاحیتیں صرف کرنے لگتے ہیں بلکہ اگر کوئی واقف کار ان کی اس خود فراموشی اور خودکشی پر انھیں متنبہ کرتا ہے اور یہ یاد دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ جن اصولوں کے خلاف تم اس وقت صف آرا ہو، وہی تمھاری رگِ حیات ہیں، تو وہ اس کی باتوں کو حیرت کے کانوں سے

بنتے اور انکار و تکذیب، طعن و تشنیع، اختلاف و عناد کی زبانوں سے ان کا جواب دیتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں جماعت بحیثیت ایک اصولی جماعت کے فنا ہو جاتی ہے اور اس کے غدار اور نالائق فرزند اپنے ہی ہاتھوں اسے قبر کی گہرائیوں میں سلا دیتے ہیں۔

دونوں موخر الذکر صورتوں میں یہ ضروری نہیں ہے کہ اس جماعت کے افراد بھی ہلاک و برباد ہو جائیں اور دنیا کی دولت اور سیاست میں ان کے لیے کوئی جگہ باقی نہ رہ جائے، بلکہ یہ ہر وقت ممکن ہے کہ عام قوانین طبعی پر عمل کر کے وہ اقوام عالم کی صفوں میں ایک نمایاں اور عظیم الشان پوزیشن کے مالک ہو جائیں لیکن اپنی تمام تر شوکتوں اور عظمتوں کے باوجود ان اصول و مقاصد کے نقطۂ نظر سے جن پر اس جماعت کی بنیاد قائم تھی، ان کا وجود و عدم برابر ہے۔ جن اصولوں کی لاش ان کے پیروں تلے روندی جا رہی ہو، ان کو اس سے کیا بحث کہ وہ فرش ذلت پر ہیں یا عرش عظمت پر۔ ان کو اگر بحث ہے تو صرف اس بات سے کہ زندگی کے میدان میں ہم کو قائم و برپا کرنے کی ان کے دلوں میں کتنی لگن ہے اور وہ اس کے لیے اپنی جان، اپنے مال، اپنے ذرائع اور اپنے قوائے ذہنی و دماغی کی کتنی قربانیاں کر رہے ہیں۔ لیکن اگر یہ کچھ نہیں ہے تو یہ اصول ان سے اپنی برأت اور بے تعلقی کا اعلان کر دیں گے اور پھر اخلاق و دیانت کا ابتدائی تقاضا یہ ہے کہ یہ لوگ بھی اپنی طرف سے انقطاع کا اظہار کر دیں۔ اب ان کے لیے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ ان اصولوں کا نام لیں اور اپنے آپ کو اس جماعتی لقب سے موسوم کریں جو ان اصولوں کی صحیح نمائندگی کے سبب انھیں ملا تھا کیونکہ اب وہ ان کے نمائندے رہے نہیں۔

اسلام بھی ایک مکمل ضابطۂ زندگی اور ایک کامل اجتماعی مسلک ہے اور "ملت اسلامیہ" یا "امت مسلمہ" وہ با اصول جماعت ہے جس نے اسلام کے دیے ہوئے اصول پر اپنی زندگی کی پوری عمارت تعمیر کی ہے۔ لیکن زندگی کے دوسرے ضوابط اور اسلام کے ضابطۂ حیات میں ایک فرق ہے، اسلام کے علاوہ دنیا میں جتنے ضوابط زندگی پیش کیے گئے ان سب کی بنیاد انسان کے اپنے دماغ کی پیداوار اور تجربات پر ہے، اس لیے مزید غور و فکر اور جدید تجربات اور معلومات کی روشنی میں اگر ان الوقت ضابطۂ زندگی کے اندر کسی ترمیم کی ضرورت ہوئی تو کر لی گئی اور بعض نئے اصولوں کا اس میں پیوند لگا لیا گیا جس پر اس ضابطۂ زندگی کے پرجوش سے پرجوش نمائندوں اور گہرے سے گہرے عقیدت کیشوں نے بھی بسا اوقات کسی احتجاج کی ضرورت نہیں سمجھی۔ لیکن اسلام کا معاملہ بالکل برعکس ہے، اس کا دعویٰ ہے کہ میرے اصول اور میرا پیش کردہ مسلک حیات کسی انسان کے ذہن و دماغ کا نتیجہ نہیں بلکہ اس علیم و خبیر کا تجویز کردہ ہے جو واقف اسرار ہے، جو بنی نوع انسان کی تمدنی ضروریات، فطری مطالبات اور انفرادی و اجتماعی مصالح کا صحیح اندازہ داں ہے اور جس کی نگاہ سے انسانی فطرت کا کوئی گوشہ بھی مخفی نہیں۔ اس لیے یہ مسلک حیات، فطرت کے ٹھوس حقائق پر مبنی ہے، عالمگیر اور جاودانی ہے، زمان و مکان کی قیود اور قومی و جغرافیائی حدود سے ماورا ہے، غیر متبدل ہے اور انسانی علوم و افکار اور تجربات اس کی کسی ایک اصل میں بھی قطع و برید نہیں کر سکتے اور اگر کسی نے اس مسلک کی اطاعت کا دعویٰ کرتے ہوئے بھی یہ جسارت کرنی چاہی تو اس کا شمار اس کے باغیوں میں ہے نہ کہ اطاعت کیشوں میں۔

کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کا یہ رویہ بہت سخت ہے۔ لیکن یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو اسلام کا منکر ہو یا حقیقت اور گمان میں فرق کرنا نہ جانتا ہو اور علمِ الٰہی کو علمِ انسانی پر قیاس کرتا ہو۔ اگر وہ اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ اسلام کے پیش کیے ہوئے اصولوں کا سرچشمہ علمِ الٰہی ہے تو اس کے کسی نقطے میں تغیر و تبدل کی ضرورت محسوس کرنا بدترین سفاہت ہے اور اس مسلکِ حیات کا ایک جانی دشمن بھی از روئے انصاف اس کو یہ حق دینے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ ایک طرف تو وہ اسلام کی عقیدت اور پیروی کا دم بھرے اور دوسری طرف اس کے اصولوں پر عملِ جراحی کرتا پھرے۔ ہاں اس کو یہ آزادی حاصل ہے کہ سرے سے اسلام ہی کو نہ مانے اگر اس کے دعوے کی صداقت میں اس کو تردد ہو اور اس کا مسلکِ زندگی اس کے نزدیک قابلِ ترمیم و اصلاح یا ناقابلِ عمل نظر آتا ہو۔

اس فرق کو ذہن نشین کر لینے کے بعد یہ بات بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے کہ اگر کسی اور با اصول جماعت کے لیے بالکل متضاد اصول اور طریقۂ زندگی سے تعاون یا مصالحت ممکن ہو تو ہو مگر اسلام کے نام پر بننے والی جماعت کے لیے تو کسی غیر اسلامی نظامِ زندگی سے مصالحت یا مداہنت کا تصور بھی ممکن نہیں۔ لیکن زمانہ کا انقلاب دیکھیے، یہ جماعت بھی آج انحطاط اور تنزل کے دھکے کھاتے کھاتے بالکل اس مقام پر پہنچ گئی ہے جہاں اسے اپنے اجتماعی مقصدِ زندگی کا نام تک یاد نہیں رہا اور خود فراموشی و خودکشی کے عبرتناک مظاہرہ میں سرگرمِ عمل ہے۔ ابتدا میں، ہر با اصول زندہ جماعت کی طرح، یہ جماعت بھی اپنے اصولِ حیات اور مسلکِ زندگی کا سچا عشق و یقین اور بے مثل جذبۂ جاں نثاری لے کر اٹھی اور اس طرح اٹھی کہ بڑی سے بڑی جانی و مالی مصیبتیں سامنے آئیں، سخت سے سخت خطرات کا مقابلہ ہوا، رات کی نیند اور دن کا سکون حرام ہو گیا، قید و بند اور دار و رسن کی آزمائشیں عام ہو گئیں، تپتی ہوئی ریت اور دہکتے ہوئے کوئلوں کی سزائیں دی جانے لگیں، گھر چھوڑنا پڑا، عزیز و اقارب سے علیحدہ ہونا پڑا، پیٹوں پر پتھر باندھ باندھ کر بھوک کی آگ دبانی پڑی، مگر تاریخ شاہد ہے، اور اس شہادت کی سچائی اور حقانیت کا انکار بڑے سے بڑا دشمنِ اسلام بھی نہیں کر سکا، کہ ہولناک مصائب کے اس امنڈتے ہوئے طوفان میں بھی اس جماعت نے کبھی اپنے ایک اصول کو بھی مجروح نہ ہونے دیا اور نہ وہ اپنے موقف سے ایک انچ ہٹنے پر کبھی راضی ہوئی، حالانکہ اگر وہ ذرا بھی مصالحت اور مداہنت کو راہ دے دیتی تو یہ سارا ہنگامۂ مصائب سرد پڑ جاتا، شب و روز کی بے اطمینانی امن و سکون سے بدل جاتی، معاشی خستہ حالیاں دور ہو جاتیں، اور پورا عرب اس کی سیاسی برتری کو بھی بڑی آسانی سے قبول کر لیتا جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے اور قرآن کے اجمالی اشارات سے معلوم ہوتا ہے:

وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ — وہ چاہتے ہیں کہ کاش تم ذرا مداہنت برتو تو وہ بھی مداہنت کی پالیسی اختیار کریں

لیکن اس کے پیرو جانتے تھے کہ یہ مداہنت ہمیشہ کی موت ہوگی اور اپنے اصولوں کو چھوڑنے کے بعد ہمارا وجود، اپنے مقصد کے لحاظ سے، بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ ادھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی بار بار تنبیہ آتی رہتی تھی کہ:-

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ ...... وَأَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ

پس اے پیغمبر، ان کے درمیان اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کرو اور اس حق کو چھوڑ کر، جو تمہارے پاس آیا ہے، ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو ...... اور ان کے معاملات میں اس قانون کے

وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (مائدہ - ۷)

مطابق فیصلہ کرو جس کو اللہ نے نازل فرمایا ہے اور ان کی خواہشات نفس کا لحاظ نہ کرو اور دیکھو! ہوشیار رہو کہیں یہ لوگ تم کو اس راہ حق اور ان قوانین ہدایت سے ذرہ برابر بھی برگشتہ کر کے فتنہ میں نہ ڈال دیں جن کو اللہ نے تم پر نازل کیا ہے۔

اس لیے اس جماعت کے رہنما اور پیکر عزم و یقین پیرو، سب کے سب آگ و خون کے طوفانوں میں بھی اپنے مرکز پر جمے رہے۔ اور حالات کی کوئی ناسازگاری یا مصلحت انھیں اپنے مسلک سے یک سر مو بھی نہ ہٹا سکی اور نہ اپنے اصول کے بارے میں انھوں نے وقتی طور پر سہی، مداہنت سے کام لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے تمام ہنگامی مسائل، مادی مصالح، ظاہری تدابیر اور دنیوی مفاد سے آنکھیں بند کر لی ہیں اور ایک جنون ہے جس نے انھیں "عقل و دانش" کا دشمن بنا ڈالا ہے، چنانچہ اس زمانہ کے سیاست دانوں اور مدبروں کا متفقہ فیصلہ بھی ان کے بارے میں یہی تھا کہ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ (انھیں ان کے دین نے فریب میں مبتلا کر رکھا ہے) مگر جلد ہی دنیا نے اس "خود فریبی" کا انجام دیکھ لیا اور سیاسیات عالم میں وہ انقلاب آیا جس کی منطقی توجیہ کرنے میں عروج و زوال امم کے نکتہ دانوں کی عقلیں دنگ ہیں۔ جن کو اپنے گھروں میں بھی سر چھپانے کی جگہ نہ ملتی تھی، قیصر و کسریٰ کے تاج و تخت ان کے قدموں میں آپڑے اور پوری ایک صدی بھی گذرنے نہ پائی تھی کہ وہ یورپ، ایشیا اور افریقہ کے بر اعظموں کے بیشتر حصوں پر چھا گئے۔ اور یہ سب کچھ اس یقین و اذعان اور وفاداری و فداکاری کے طفیل ہوا جو ان کے دلوں میں اپنے اصول و مقاصد کے لیے موجود تھی اور جس نے انھیں اپنے مسلک زندگی کے لیے جینا اور مرنا سکھا دیا تھا۔

اس کے بعد اس جماعت پر وہ دور آیا جب اس کے افراد کے ذہنوں میں اصول و مقاصد کے نقوش ماند پڑنے لگے اور مختلف خارجی اسباب کے باعث ان کے اندر مداہنت کی بیماری جڑ پکڑنے لگی جو امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی گئی، غیر اسلامی اصول و نظریات مسلمانوں میں کثرت سے پھیلنے لگے جن کی روک تھام کے لیے علماء حق کی طرف سے بہتری کوششیں بھی ہوتی رہیں مگر ناتربیت یافتہ عوام الناس کی خام مذہبیت اور حکومتوں کی فرض ناشناسی نے ان کوششوں کو پوری طرح کامیاب نہ ہونے دیا اور یہ بیماری آہستہ آہستہ اسلامی اصول کی جڑیں کھوکھلی کرتی رہی۔ لیکن جب تک اس جماعت کا سیاسی اقتدار قائم رہا، ان اصولوں کے بارے میں اس نے بحیثیت مجموعی خود فراموشی اور خودکشی کی راہ نہیں اختیار کی۔ لیکن، جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، یہ مداہنت اور مصالحت کی پالیسی بجائے خود موت کا پیش خیمہ ہے۔ جس سرچشمہ سے جماعت کی سیاسی طاقت کو غذا ملتی تھی، جب اس سے اس نے اعراض برتنا شروع کیا تو اس کا لازمی نتیجہ سیاسی زوال کی شکل میں نمودار ہوا جس کے بعد ہی اس پر تنزل اور انحطاط کا آخری دور شروع ہو گیا اور آہستہ آہستہ اب وہ وقت آن پہنچا ہے کہ یہ جماعت اپنے آپ کو پہچانتی بھی نہیں، اس کے افراد کی غالب ترین اکثریت اپنے اصول و مقاصد، اپنے مسلک اور اپنے وجود کی غرض و غایت کو اس طرح فراموش کر چکی ہے کہ اگر ان چیزوں کو اس کے سامنے رکھا جائے تو نہ صرف ان سے اجنبیت اور بیگانگت محسوس کرتی ہے بلکہ پوری طمانیت قلب اور ادعائے تحقیق کے ساتھ اس کو غیر اسلام ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے اور جو چیز ان اصولوں کی عین ضد ہے اس کو اسلام کا منتہائے مقصود قرار دینے پر مصر ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کی تمام تر جد و جہد اپنے ہی مقصد حیات کی پامالی پر مرکوز ہے اور خوش فہمی یہ ہے کہ یہ اسلام اور جماعت مسلمین کی سرفرازی کا باعث ہوگا۔ وھلم جرا

يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا۔

ایک تھوڑی سی تعداد ایسے لوگوں کی بھی اس جماعت میں موجود ہے جو خود فراموشی اور خودکشی کے اس مقام تک ابھی نہیں پہنچی ہے، اس کی نگاہ اپنے نصب العین کے جلووں سے ابھی تک آشنا ہے، وہ اسلام کے اصول و مقاصد کی یاد اپنے سینوں میں دبائے ہوئے ہے۔ مگر یہ یاد محض ایک متبرک "یادگار" بن کر رہ گئی ہے جس میں زندگی کی حرارت یا تو مفقود ہو چکی ہے یا اتنی خفیف کہ محسوس نہیں ہوتی۔ الا ماشاء اللہ حالات کی ناسازگاری، مخالف قوتوں کی قہاری اور ماحول کی نامساعدت نے سروں میں وہ سودا باقی نہیں رہنے دیا جس کے بغیر کسی اصول یا مقصد کا نام لینا ہی حرام ہے۔ ان لوگوں نے مداہنت اور مصالحت کی پُرامن روش اختیار کر رکھی ہے اور اس امر کی پوری احتیاط کرتے رہتے ہیں کہ کہیں ان پر سیاست و تدبر کی زبان سے غَرَّ هٰؤُلَاءِ دِينُهُمْ کی پھبتی نہ کس دی جائے۔

ان حالات میں یہ جماعت اگر دنیوی جاہ و اقبال کی مالک ہوتی تو بھی اسلام کو اس سے کوئی بحث اور دلچسپی نہ ہوتی اور نہ اس کا مجرد سیاسی اقتدار اس کی نظروں میں کوئی وقعت رکھتا، اس کو تو جو کچھ بحث و دلچسپی ہے صرف اپنے نصب العین کی اقامت سے ہے، اس نصب العین کو پس پشت ڈال کر اگر اس کے نام لینے والوں نے دولت کونین بھی حاصل کر لی تو اس کے کس کام کی؟ مگر بدقسمتی سے یہ چیز بھی آج اس جماعت کو حاصل نہیں۔ اس نے اپنے اصول زندگی کو ترک اور فراموش کر کے جو کچھ پایا وہ ذلت اور محکومی کا وہ داغ ہے جو ہر جماعت کی پیشانی پر تو لگ سکتا ہے مگر سلطانِ کائنات کی پارٹی — حزب اللہ — کی پیشانی پر کبھی نہیں لگ سکتا۔

قرآنی فلسفۂ عروج و زوال امم

یہاں ایک ایسا سوال پیدا ہوتا ہے جو آجکل عام مسلمانوں کے ذہنوں میں بار بار کھٹکتا اور ان کے لیے بڑی حیرانی کا باعث بنا ہوا ہے، وہ وہ یہ کہ یہ سوچتے ہیں کہ آخر ہماری موجودہ زبوں حالی کا سبب کیا ہے؟ یہ ہمیں تسلیم ہے کہ ہم بدعمل ہو گئے ہیں، ہمارے ایمان میں کمزوری آ گئی ہے، ہمارے اخلاق تباہ ہو چکے ہیں، ہم احکام دین سے غافل ہیں، یہ سب کچھ صحیح، مگر پھر بھی ہم ہی توحید کے تنہا علمبردار ہیں، ہم اگر اپنے سر جھکاتے ہیں تو خدا ہی کے سامنے جھکاتے ہیں، اس کے رسول کا حلقۂ اطاعت ہے تو صرف ہماری گردن میں ہے، اس کے احکام پر اگر کچھ عمل کرتے ہیں تو ہم ہی کرتے ہیں — اور ہمارے بالمقابل ساری دنیا کافر و مشرک ہے، خدا کی باغی اور توحید کی منکر ہے، رسول کی نبوت اور قرآن کی دشمن ہے۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ ہم پست وہ سربلند، ہم مفلس اور وہ دولتمند، ہم ذلیل و خوار اور وہ صاحبِ اقتدار، ہم غلام و محکوم اور وہ آزاد و حکمراں۔ حالانکہ ہم بہرحال غیروں کی بہ نسبت اللہ سے زیادہ قریب ہیں اس لیے ان کے مقابلہ میں ان الٰہی انعامات کے ہم زیادہ مستحق تھے نہ کہ وہ!

یہ سوال عروج و زوال امم کے اس فلسفہ سے ناواقفیت کی بنا پر پیدا ہوتا ہے جس کو قرآن حکیم نے بیان فرمایا ہے۔ ورنہ طبعی اور اخلاقی، دونوں حیثیتوں سے ہم ٹھیک اسی مقام پر ہیں جہاں ہونا چاہیے تھا۔ اس کشمکش حیات میں دو قسم کے قوانین مصروف عمل ہیں، ایک تو قوانین طبیعی، دوسرے قوانین اخلاقی[1] قوموں کے ابھارنے اور گرانے میں یہ دونوں

[1] اخلاق سے ہماری مراد قرآنی اور دینی اخلاق ہیں، نہ کہ افادی یا تجربی اخلاق، ورنہ افادی اور تجربی اخلاق سے عاری ہو کر (بقیہ بر صفحہ ۵۵)

ہی قسم کے قوانین کام کرتے ہیں، مگر دونوں میں ایک فرق ہے، اور وہ یہ کہ تنہا قوانین طبعی ایک قوم کو میدان مقابلہ میں فتح و غلبہ دلا سکتے ہیں لیکن قوانین اخلاقی میں قدرت نے یہ قوت نہیں رکھی کہ وہ تنہا کسی قوم کو اٹھا کر تخت سلطانی پر بٹھا دیں۔ قوانین اخلاق کو قوموں کی باہمی کشمکش اور جنگی معرکوں میں "خصوصی اختیار (Veto Power)" کی حیثیت حاصل ہے، یعنی اگر دونوں فریق جنگ صرف مادی تیاریوں کے ساتھ نبرد آزما ہوں تو فتح اس کی ہوگی جو زیادہ اسباب و ذرائع جنگ کے ساتھ میدان مقابلہ میں آیا ہوگا اور اگر ایک طرف مادی قوتیں ہوں اور دوسری طرف محض اخلاقی اور روحانی قوتیں ہوں تو فریق ثانی کا شکست کھانا یقینی ہے، لیکن اگر مادی قوتوں اور اسباب و ذرائع کے اعتبار سے دونوں فریق برابر ہوں مگر ساتھ ہی ایک فریق اخلاقی آلات سے بھی مسلح ہے تو اس کا غالب ہونا بھی یقینی ہے بلکہ قرآنی تصریحات تو یہ بتاتی ہیں کہ اگر مادی وسائل کے اعتبار سے وہ فروتر بھی ہو، حتیٰ کہ اگر فریق مخالف کا دسواں حصہ ہو تو بھی اللہ تعالیٰ کی غیبی اور مافوق الفطری اعانتیں اس کو کامرانی اور فتح مندی سے ہمکنار کر دیتی ہیں، لیکن شرط یہی ہے کہ ایک طرف تو اس نے اپنے امکان اور مقدور بھر مادی وسائل اور تدابیر سے کام لینے میں دریغ نہ کیا ہو اور دوسری طرف قرآنی مطالبات کے مطابق اپنے ایمان کو راسخ اور اعمال کو صالح بنا لیا ہو۔ یعنی یہ کہ اس میں اپنے اصولوں کا حقیقی عشق اور اپنے مسلک زندگی کا زندہ جنون موجود ہو۔ تائید غیبی اور اعانت مافوق الفطری کا یہی وعدہ ہے جو قرآن کی ان آیات میں کیا گیا ہے:-

(۱) وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَبَقُوا إِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُونَ (انفال-۸)
اور کافر ہرگز یہ گمان نہ کریں کہ وہ بازی لے گئے، نہیں وہ ہم کو عاجز نہ کر سکیں گے۔

(۲) كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ
کتنی ہی چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر، بحکم خدا، غالب ہوئی ہیں۔

(۳) يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (انفال-۸)
اے نبی تمہارے لیے اللہ کافی ہے اور تمہارے پیرو مسلمانوں کے لیے۔

(۴) لَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (آل عمران-۱۴)
نہ سست پڑو اور نہ غمگین ہو، تم ہی غالب رہو گے بشرطیکہ تم مومن ہو۔

(۵) إِنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ
یقیناً زمین کے وارث میرے صالح بندے ہی ہوں گے۔

(۶) وَمَنْ يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ (مائدہ-۸)
اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کو اپنا ساتھی بنائے گا (وہ بامراد اور سربلند ہوگا) کیونکہ اللہ ہی کی جماعت غالب رہنے والی ہے۔

اس اعانت غیبی کے ظہور کی مثالیں ہر دور میں پائی جا سکتی ہیں، خود اس امت کی ابتدائی تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ بدر و احد اور احزاب و حنین کے معرکوں میں خدا کی "غیر مرئی افواج" نے جو کچھ کیا اس پر قرآن تک کی شہادت

(بقیہ صفحہ ۵۳) محض قوانین طبعی کے بل پر بھی کوئی قوم فتح و غلبہ نہیں حاصل کر سکتی۔ یہاں ہم نے انفرادی اور تجربی اخلاق کو بھی قوانین طبعی کے ضمن میں شمار کیا کیونکہ یہاں عام اقوام کے عروج و زوال سے ہم بحث نہیں کر رہے ہیں بلکہ امت مومنہ کے عروج و زوال تک یہ بحث محدود ہے۔

موجود ہے، جس کا انکار کرنے کے لیے پہلے قرآن کا انکار کر لینا ضروری ہے۔

نعمت بقدر رحمت

لیکن جہاں اس جماعت کو قدرت کی یہ خصوصی نظرِ عنایت حاصل ہے، وہیں اس کی ذمہ داریاں بھی بہت نازک ہیں، اور اس کو اس وعدۂ خاص کے ساتھ ایک وعیدِ خاص بھی سنا دی گئی ہے جس کی طرف سے اس نے اپنے کان بند کر لیے ہیں لیکن یہی کان بند کر لینا اس کے لیے بڑی غلط فہمیوں اور ہلاکتوں کا باعث بن گیا اور وہ سوال پیدا کر گیا ہے جس کو ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ قرآن نے اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور نعمتوں، اس کی محبوبیت اور مبغوضیت، اور اس کی جزا و سزا کا یہ قانون بیان فرمایا ہے کہ جس فرد یا گروہ پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم جتنا ہی زیادہ ہوتا ہے، اس فضل و کرم کی ناشکری اور احکامِ الٰہی سے بغاوت کے وقت اس کی گرفت بھی اتنی ہی زیادہ سخت اور ہولناک ہوتی ہے، اور محکومی و نامرادی کی جو سزا وہ دوسری قوموں کو برے اعمال کی پاداش میں دیا کرتا ہے، انھی برے اعمال کے ارتکاب پر اس قوم کو اس سے دوگنی یا کئی گنی سزائیں دیتا ہے جو اس کے انعامات سے سرفراز ہو۔ اس آسمان کے نیچے اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ محبوب اور مقرب بندہ جو عالمِ وجود میں آیا وہ محمد رسول اللہ صلعم تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ان انعامات سے نوازا جو کسی کو بھی نصیب نہ ہوئے اور جن پر اس نے اپنی نعمت کی تکمیل کر دی، مگر ساتھ ہی انھیں یہ بات بھی سنا دی گئی تھی کہ:۔

وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ۝ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا (بنی اسرائیل ۸)

اگر ہم تم کو اچھی طرح ثابت قدم نہ رکھتے تو قریب تھا کہ تم ان کفار کی طرف کچھ نہ کچھ جھک پڑتے (اگر ایسا ہوتا تو) یقیناً ہم اس وقت تم کو زندگی اور موت دونوں میں (یعنی دونوں جہان میں) دوہرا عذاب چکھاتے۔ پھر تم ہمارے مقابل کسی کو اپنا مددگار نہ پاتے۔

ازواجِ مطہرات کو جہاں یہ رتبہ بخشا گیا تھا کہ وہ امہات المومنین ہیں اور ان کی حیثیت عام عورتوں جیسی نہیں ہے (يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَاءِ) اور یہ کہ اگر وہ اللہ اور اس کے رسول کی صدقِ دل سے تابعداری کریں اور اچھے کام کریں تو عام لوگوں کی بہ نسبت ان کو دوگنا اجر ملے گا (وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا (احزاب۔ ۴) وہیں اس حقیقت سے بھی انھیں آگاہ کر دیا گیا تھا کہ:۔

يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ (احزاب۔ ۴)

اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو کوئی کسی کھلی ہوئی بے حیائی کی مرتکب ہوگی اس کو دوگنا عذاب دیا جائے گا۔

یہودی قوم وہ قوم ہے جس پر انعاماتِ الٰہی کی بارش ہوتی رہی، جس کو دشمن سے بچانے کے لیے سمندر خشک کر دیا گیا، جس کی معاشی مشکلات کے وقت من و سلویٰ کا نزول ہوتا رہا، اور بقول بائبل جس کی بیاباں نوردی کے وقت خود خداوندِ عالم بدلیوں کی شکل میں اس پر سایہ کرتا ہوا چلتا، اور جس کو، بقول قرآن، تمام اقوامِ عالم پر فضیلت دی گئی تھی لیکن جب اسی محبوب اور لاڈلی قوم نے اپنے عہد کو فراموش کر دیا، اپنی ذمہ داریوں کو پسِ پشت ڈال دیا، احکامِ الٰہی سے سرتابی کر بیٹھی اور فسق و فجور میں غرق ہو گئی تو اس پر اللہ کا غضب اس طرح ٹوٹ پڑا جس کی نظیر پیش کرنے سے پوری تاریخِ انسانی قاصر ہے۔ جتنی یہ قوم سربلند تھی اتنی ہی ذلیل ہو گئی، جس قدر محبوب تھی اسی قدر مغضوب ہو گئی۔

غرض یہ اللہ تعالیٰ کی ایک نہ بدلنے والی سنت ہے کہ اس کی "نعمت بقدر رحمت" ہوا کرتی ہے اور یہ سنت بالکل مطابق فطرت ہے، ہم ایک اجنبی سے اس حسن سلوک کے امیدوار نہیں ہوتے جس کی امید ہمیں اپنے اعزہ سے ہوتی ہے، ایک غیر شخص اگر ہماری باتوں کو نہیں مانتا یا اس کی تکذیب اور مخالفت کرتا ہے تو ہم اس پر زیادہ رنجیدہ یا مشتعل نہیں ہوتے لیکن یہی بات اگر اپنے کسی نمک خوار غلام یا ناز پروردہ بیٹے کی طرف سے وجود میں آئے تو اس وقت ہمارے غم و غصہ کی انتہا نہیں رہتی اور ہم اس کی اس حرکت کا وہ جواب دیتے ہیں جو ایک غیر آدمی کو کبھی نہیں دے سکتے۔ کیونکہ غیر کی مخالفت کا مطلب زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ وہ ایک سچی بات کا منکر اور دشمن ہے، لیکن اس یگانے کی مخالفت کا مطلب یہ ہے کہ اس میں مخالفتِ حق کے ساتھ ساتھ نمک حرامی بھی ہے، جو ضمیر انسانی کی سب سے بڑی اور گھناؤنی رذالت ہے۔ بالکل یہی اصول اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے بارے میں برتتا ہے اور ان افراد یا اقوام کو، جو اس کی عنایات اور افضال کا مورد ہونے کے باوجود، اس کے احکام کی مخالفت پر اتر آتی ہیں، عام حالات کی بہ نسبت دگنی سزائیں دیتا ہے کیونکہ وہ بیک وقت دو جرموں کی مرتکب ہوتی ہیں ایک تو مخالفتِ حق کی، دوسرے نمک حرامی کی۔

ہماری موجودہ حالت امت مسلمہ کو اسی سنت الٰہی کی روشنی میں اپنے ماضی اور حال کا جائزہ لینا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا اس امت کے ساتھ کیا معاملہ رہا ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اس نے اس امت کو وہ ساری نعمتیں بخشیں جو اس سے پہلے دوسری تمام اقوام کو دی گئی تھیں اور اس کے علاوہ وہ نعمتیں بھی جو اب تک کسی قوم کو نہیں ملی تھیں؟ آخر یہ سارے عالم کی امامت کا منصب[۵۱] اور خیر الامم[۵۲] کا خطاب، یہ امت وسط[۵۳] اور شہداء علی الناس[۵۴] کے القاب، یہ اکمال دین[۵۵] اور اتمام نعمت[۵۶] کے انعامات اس سے پہلے بھی کسی امت کو ملے تھے؟ یقیناً نہیں۔ پھر غور کیجیے کہ اس امت کی ذمہ داریاں کتنی بھاری ہیں اور ان ذمہ داریوں کو پس پشت ڈالنے کے نتائج کتنے خطرناک ہو سکتے ہیں۔ جو قانون خداوندی اپنے محبوب پیغمبر اور اس کی محترم ازواج کے لیے اس طرح تیغ بے نیام تھا وہ دوسروں کے بارے میں کب کوئی نرمی دکھا سکتا ہے۔ پس یہ امت آج اپنے کو جس حال میں پا رہی ہے وہ اسی اصول کے مطابق ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے ایک نصب العین اور ایک ضابطۂ حیات عطا فرمایا تھا اس ضابطہ کا نام دین الحق ہے اور اس کی تفصیلات کے مجموعہ کا نام قرآن ہے۔ یہ قرآن اپنے کو اس میثاق کی دستاویز قرار دیتا ہے جو اللہ نے اپنے بندوں سے لیا ہے اور جس کی پابندی کا ہر مسلمان نے اپنے رب سے معاہدہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس میثاق کو بندوں کے لیے ایک نعمت قرار دے کر اور یہ بتا کر کہ تمہاری کامیابی و ناکامی کا انحصار اسی میثاق کی پابندی پر ہے، فرمایا ہے کہ:۔

---

۵۲ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ الخ (تم وہ بہترین امت ہو جو تمام لوگوں (کی امامت و رہنمائی) کے لیے معرض وجود میں لائی گئی ہے، تم کو نیکی کا حکم دینا چاہیے الخ)۔ ۵۴ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک عادل اور درمیانی امت بنایا تاکہ تم سب لوگوں کے لیے حق کے گواہ بنو) ۵۶ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمتیں تمام کر دیں)۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (مائدہ - ۲)

اور اللہ نے تم کو جو نعمت عطا کی ہے اس کو یاد رکھو اور اس میثاق کو نہ بھولو جس کو اس نے تم سے باندھا ہے، جبکہ تم نے کہا تھا کہ ہم نے سنا اور مانا۔

تمام احکام قرآنی اسی معاہدۂ عبد و معبود کی دفعات ہیں جن میں سے ہر ایک کے متعلق حکم ہے کہ اس کو پورا کیا جائے اور ہر حال میں ٹھیک ٹھیک اس کی پابندی کی جائے۔ (يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۔ اے ایمان لانے والو! اپنے عہدوں کو پورا کرو) پھر ایک جامع ہدایت یہ کر دی گئی کہ:۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (اعراف - ۱)

تمہارے رب کی طرف سے جو کچھ نازل ہوا اسی کی پیروی کرو، اور اس کو چھوڑ کر (دوسرے جھوٹے) خداوندوں کا اتباع نہ کرو۔ (خواہ یہ خداوند اوثان و اصنام ہوں، خواہ امراء و ملوک، خواہ آباء و اجداد ہوں خواہ اپنا نفس)

قرآن کے اس مطالبہ کو سننے کے بعد دو ہی راہیں اختیار کی جا سکتی ہیں، یا تو اس کا انکار کر دیا جائے، یا پھر غیر مشروط طریقہ پر سر تسلیم خم کر دیا جائے اور ہر اس پابندی کو عملاً قبول کر لیا جائے جو رب کائنات کی طرف سے نازل اور عائد کی گئی ہو۔ ایک معمولی سمجھ کا آدمی بھی اس واضح حقیقت کے ادراک سے عاجز نہیں رہ سکتا۔ اس لیے وہ شخص بدترین جہالت اور سفاہت کا ثبوت دے گا جو بعض پابندیوں کو تو مانے اور بعض سے گریز کرے۔ یہ پوزیشن عقل انسانی کے نزدیک بھی بالکل مضحکہ خیز اور ناقابل تسلیم ہے اور قرآن کے نزدیک بھی۔ چنانچہ قرآن اپنے اس مطالبہ کے ساتھ ہی ان لوگوں کو جو بین بین کی روش اختیار کرتے ہیں، ان لفظوں میں زجر و ملامت کرتا اور اس کے خوفناک نتائج سے یوں متنبہ کرتا ہے:۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (بقرہ - ۱۰)

کیا تم کتاب الٰہی کی بعض باتوں کو مانتے ہو اور بعض کو نہیں مانتے؟ سو ایسا کرنے والوں کی سزا اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ دنیا میں ذلیل و خوار ہوں اور آخرت میں ایسے لوگوں کو شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیا جائے گا۔ اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔

بنی اسرائیل کی تاریخ اس قانون جزا کی زندہ شہادت ہے۔ ان کو خدا نے ایک کتاب دی تھی اور اس لیے دی تھی تاکہ اس کے احکام کی پابندی کریں اور اس کے بتائے ہوئے طریقہ پر اپنی زندگی کا نظام چلائیں۔ مگر انھوں نے اس کتاب کے ساتھ سلوک یہ کیا کہ ایک طرف تو اس میں تحریف کرنے لگے۔ دوسری طرف جو کچھ بھی اصل تعلیم باقی رکھ چھوڑی تھی اس کے بھی ایک بڑے حصہ کو اپنی دنیائے عمل سے خارج کر دیا۔ جیسا کہ قرآن بتاتا ہے:۔

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ (مائدہ - ۳)

یہ لوگ الفاظ کا الٹ پھیر کر کے بات کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں اور جو تعلیم انھیں دی گئی تھی اس کا ایک حصہ بھلا چکے ہیں۔

"بھلا دینے" کا یہ مطلب نہیں کہ کتاب کا یہ حصہ ان کے حافظہ سے محو ہو گیا تھا، نہیں، وہ تو تحریری شکل میں موجود تھا، اور کتاب الٰہی ہدایت حاصل کرنے کے لیے آتی ہے، نہ کہ حفظ کرنے کے لیے، سو اصل مقصود اس کتاب سے وہ بخوبی حاصل کر سکتے تھے لیکن اس کتاب کے اجارہ دار فریسیوں نے کیا یہ کہ مختلف سیاسی، معاشی اور دوسری اغراض و مصالح کے

پیش نظر بہت سے احکام کو معطل کر دیا، کتنے ہی قوانین تھے جن کو فاسق امراء کی خاطر بدل کر نرم بنا ڈالا اور کتنی ہی آیتیں تھیں جنکے مطالب بہ مقتضیات کردہ دوسروں سے چھپا کر رکھتے اور معاملات زندگی میں ان کو زیر بحث آنے ہی نہ دیتے۔ قرآن مجید نے ان کی اسی مجرمانہ حرکت کا اعلان کیا جب اس نے کہا:-

..... تَجْعَلُونَهُ قَرَاطِيسَ تُبْدُونَهَا وَتُخْفُونَ كَثِيرًا (انعام - ۱۱)

جس (توراۃ) کو تم متفرق اوراق میں رکھکر لوگوں کو دکھاتے ہو اور (اس کے مطالب واحکام کا) بڑا حصہ چھپا جاتے ہو۔

پھر اسی چیز کو ایک دوسرے انداز میں یوں کہا کہ:-

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ فَنَبَذُوهُ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا (آل عمران - ۱۹)

اور یاد دلاؤ اس وقت کو جب اللہ نے اہل کتاب سے عہد لیا تھا کہ دیکھو! تمھیں اس کتاب کو لوگوں کے سامنے کھول کھول کر بیان کرنا ہوگا اور اسے چھپا کر نہ رکھنا۔ مگر انھوں نے اس کو پس پشت ڈال دیا اور تھوڑی سی قیمت پر اسے بیچ ڈالا۔

"پس پشت ڈال دیا" کے الفاظ بتاتے ہیں کہ اللہ کی کتاب ان کے پاس موجود تھی مگر جب زندگی کے معاملات سامنے آتے تو اس سے رہنمائی حاصل کرنے کی بجائے جزدانوں میں لپیٹ کر کہیں حفاظت سے رکھے رہتے۔

کتاب الٰہی کے ساتھ ان کا یہی طرز عمل تھا جس کو فَنَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ کے جامع الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور جس کی عملی تفسیر یہود کے ان اخلاق ذمائم اور شیطانی اعمال سے ہوتی ہے جن کی تفصیل سے قرآن بھرا پڑا ہے، گویا عملی طور پر وہ توراۃ کے ایک حصہ کا انکار کر رہے تھے جس کا انجام اس ذلت اور مسکنت کی صورت میں نمودار ہوا جو خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا کی سب سے نمایاں مثال ہے۔

غرض قرآن کا مطالبہ کامل حوالگی کا ہے یعنی جو کچھ بھی وہ کہے اس پر اور صرف اسی پر عمل ہونا چاہیے۔ اس نے اپنے تبعین کے لیے جو حدیں، زندگی کے مختلف شعبہ جات میں قائم کر دی ہیں، ان سے آگے قدم اٹھانے کی سرے سے کوئی گنجائش نہیں ایسا کرنے والوں کو وہ ظالم قرار دیتا ہے۔ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ۔ اس لیے قرآن پر ایمان لانے اور مسلم ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے اندر جو کچھ ہے اس کو یا اس کے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ جزو کو کبھی ترک نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن آج صورت واقعہ کیا ہے؟ دماغ کو تمام خارجی تاثرات سے آزاد کر کے مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ پر اول سے آخر تک نظر ڈال جائیے اور اس کے بعد اپنی روزمرہ کی زندگی کا گہرا جائزہ لیجیے اور پھر اندازہ کیجیے کہ قرآن کے کتنے احکام پر عمل ہو رہا ہے؟ چھوڑ دیجیے ان لوگوں کو جو "مسلمان" ہوتے ہوئے بھی اسلام کے علانیہ باغی اور اس کے اصولوں کی سچائی کے منکر ہیں یا جن کی زندگی کے لمحات ایک ایک کر کے اسلامی قوانین کے توڑنے اور ہوائے نفس کے اتباع میں صرف ہوتے رہتے ہیں اور جن کو فقہی اصطلاح میں فاسق و فاجر کہا جاتا ہے۔ ان افراد اور حلقوں کی طرف نگاہ دوڑائیے جو نیکی اور تقویٰ اور ایمان و عمل کے لحاظ سے مردان کامل کہے جاتے ہیں۔ یہاں بھی آپ کو جو کچھ دکھائی دے سکتا ہے وہ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ ان لوگوں کی زندگی [illegible] ان احکام الٰہی کے [illegible] ہے جن کا تعلق انفرادی زندگی سے ہے، نماز اور روزوں کی پوری پوری پابندی ہوتی ہے، اوراد و وظائف کی کثرت ہے، زکوٰۃ و صدقات بھی

ادا ہو رہے ہیں، جھوٹ، غیبت، بدگوئی اور بہتان تراشی سے زبان آلودہ نہیں ہونے پاتی۔ کبر و غرور، نمود و ریا، خیانت، بدعہدی، ظلم و غضب، رشوت و حرام خوری اور فتنہ و فساد کے دھبوں سے ان کے ایمان کا دامن پاک رہتا ہے۔ باقی رہے اجتماعی احکام و مسائل، سو یہاں بھی ان سے غفلت اور بے اعتنائی کا وہی حال ہے جو غیر متقی حلقوں میں نظر آتا ہے۔ قرآن نے اگر زندگی کے صرف انفرادی پہلو سے ہی بحث کی ہوتی تب تو بلاشبہ اس طرح اتباعِ قرآن کا حق ادا ہو جاتا مگر وہ تو زندگی کے اجتماعی مسائل کو بھی اتنی ہی اہمیت کے ساتھ لیتا ہے جتنی اہمیت سے انفرادی مسائل کو۔ اس نے نماز، روزے، حج اور زکوٰۃ کے فرائض ادا کرنے، اور دیانت، امانت، اخلاص، وفائے عہد، حسن سلوک، اکل حلال اور صدق مقال وغیرہ اخلاق فاضلہ پر کاربند ہونے کی ہدایتیں دینے کے ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی بھی عبادت کے لائق اور حاکمیت و فرمانروائی کا مستحق نہیں اس لیے اسی کو اپنا آقا اور سلطان مانو۔ (اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ) (اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ۔ خدا ہی کی بندگی کرو اور تمام باطل معبودوں کو چھوڑ دو)۔ خدائی اور فرمانروائی کے ان تمام جھوٹے مدعیوں کے دعاوی تسلیم کرنے سے انکار کرو جو خدا کی بادشاہت کے باغی ہو کر اس کی رعایا پر اپنا حکم چلانا چاہتے ہیں۔ (وَقَدْ اُمِرُوْا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ) ان لوگوں کا کہنا نہ مانو جو اللہ کے حقوق سے غافل اور اس کی حدود کو توڑنے والے ہیں۔ (وَلَا تُطِيْعُوْا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ) جب فیصلہ کرو تو احکامِ الٰہی کے مطابق کرو۔ (فَاحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ) اور جب اپنا فیصلہ کراؤ تو انہی احکام کے ماتحت کراؤ، ورنہ غیر الٰہی قوانین کی عدالت میں اپنا معاملہ لیجانے والا منافق ہے (يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْا اِلَى الطَّاغُوْتِ) اور قوانین الٰہی کو چھوڑ کر دوسرے قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے والا ظالم، فاسق، اور کافر ہے (وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ...... اَلْفٰسِقُوْنَ ...... اَلْكٰفِرُوْنَ)۔ کسی برائی، کسی ظلم اور کسی عدوان کے پروان چڑھانے میں کسی طرح کا تعاون نہ کرو (لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ) کفر کے علمبرداروں سے لڑو یہاں تک کہ کفر کا علم سرنگوں ہو جائے اور اللہ ہی کی اطاعت رہ جائے (وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ) تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے وہ اللہ اور اس کے رسول کا محارب ہے، اس کو قتل کر دو (اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا الخ)۔ جو چوری کرے اس کے ...... ہاتھ کاٹ دو (وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا)۔ جو بدکاری کرے اس کو سو کوڑوں کی سزا دو (اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ) جو کوئی کسی پاکدامن پر زنا کا جھوٹا الزام لگائے اس کو اسی درے لگاؤ۔ (وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً) جو کوئی کسی کو عمداً قتل کر دے، اس کی بھی گردن اڑا دو (يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ الخ)۔

یہ ان بہت سے احکام میں سے چند ہیں جو ہماری اجتماعی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کو بطورِ مثال بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ سب کے سب اسی قرآن میں موجود ہیں جس میں نماز روزے کے احکام درج ہیں، اس لیے اس جماعت کے لیے جس نے اللہ کی کتاب پر پورا پورا عمل کرنے کا اقرار کیا ہے، یہ سارے احکام بھی اسی طرح واجب التعمیل ہیں جس طرح وہ دوسرے تمام

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اپنی اساسی اہمیتوں کے پیش نظر ان میں سے اکثر احکام تو ایسے ہیں جو مدار ایمان اور شرط نجات ہیں اور ایک مسلمان کے لیے اولین توجہ کے مستحق۔ لیکن خالص "دینی اور ملی" حلقوں میں بھی ان پر عمل کا سراغ ملنا تو درکنار، عمل کی خواہش کا وجود بھی عنقا ہے۔ آج ہمارا معبود اور شہنشاہ اللہ تعالیٰ ضرور ہے مگر مسجد کی چار دیواریاں اس کی معبودیت اور شہنشاہیت کی آخری حدیں ہیں اور مسجد سے باہر ہمارے ارباب امر و حکم وہ لوگ ہیں جو ہماری ہی طرح مخلوق ہیں اور خود بھی اسی ایک آقا کی غلامی اور اسی ایک حاکم علی الاطلاق کے قانون کی پیروی کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر تو وہ ہیں جو اللہ و رسول کے علانیہ باغی اور کفر و ضلال کے امام ہیں۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں جو "مسلمان" ہیں لیکن ایسے مسلمان جنھوں نے اللہ کے ان حقوق فرمانروائی کو، جن کا تعلق دنیا میں انسانوں کی اختیاری زندگی سے ہے، اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ قریب قریب پوری امت مسلمہ ان دو قسم کے ارباباً من دون اللہ کو اپنا صاحب امر و حکم بنائے ہوئے ہے، اب اس کے لیے قانون وہ ہے جو یہ خداوندان ارضی نافذ کریں نہ کہ وہ جو کتاب و سنت میں ہے۔ پھر جب انسانی زندگی کے بنیادی مسائل میں سے اس مرکزی مسئلہ میں کہ انسان کا اصل حاکم اور قانون ساز کون ہے، اس امت نے پہلے مداہنت اور بالآخر تعاون کی پالیسی اختیار کرلی اور اپنے ہی جیسے انسانوں کے ہاتھوں میں اپنے نظام سیاست کی باگیں دے کر انہی کو اپنا اصل آمر و ناہی تسلیم کر لیا تو اس کے وہ بہت سے مسائل زندگی جن کا تعلق براہ راست حکومت سے ہوا کرتا ہے آپ سے آپ غیر قرآنی بنیادوں پر طے ہونے لگے، اب اس کے اصول زندگی، اس کے نظریات سیاسی، اس کے تصورات معاشی اور اس کے افکار عمرانی کی بنیاد ہی بدل گئی اور اس کی زندگی کا پورا ڈھانچہ اور مسائل زندگی پر غور و فکر کرنے کا طرز ہی کچھ اور ہو گیا۔ اب اس کو اللہ وحدہ لاشریک لہٗ کی غیر منقسم حاکمیت کے بجائے انسانوں کی حاکمیت میں اعتقاد ہے اب وہ اس نظام زندگی کو، جو اپنے اصول و فروع میں سرتاپا غیر اسلامی، غیر قرآنی بلکہ کافرانہ ہے، نہ صرف انگیز کر رہی ہے بلکہ اس کی مشین چلانے میں مسابقت دکھا رہی ہے۔ اب اس کے افراد نہایت اطمینان کے ساتھ اللہ کے نازل کردہ قوانین کو چھوڑ کر انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق فیصلہ کرتے اور کراتے ہیں حالانکہ انھیں علم ہے کہ اس معاملہ میں اللہ کا حکم یہ نہیں ہے۔ اب ارتداد، سرقہ، زنا، قذف اور قتل کے جرائم کی پاداش کہیں بھی قتل، قطع ید، جلد اور قصاص و دیت کی شکل میں نہیں دی جاتی حالانکہ انھوں نے اپنے فرمانروائے حقیقی سے عہد کیا تھا اور حلف وفاداری اٹھایا تھا کہ ہم ان تعزیرات اور حدود کو قائم کریں گے۔ اس طرح قرآن کا ایک بڑا حصہ صرف کتابت اور تلاوت کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے جس کو اس کے ماننے والوں کی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر انسان کے اندر تعلیمات قرآنی کا حقیقی فہم اور اسلام کی صحیح بصیرت موجود ہو اور تاویلات و تسویلات نفس نے اس کی روح ایمانی کو تھپکیاں دے کر سُلا نہ دیا ہو تو وہ بیک نظر محسوس کرسکتا ہے کہ قرآن کے ساتھ بڑی حد تک وہی سلوک کیا جا رہا ہے جو اہل کتاب نے توراۃ اور انجیل کے ساتھ کیا تھا۔ چونکہ قرآن اللہ تعالیٰ کا آخری ہدایت نامہ تھا جس کے باعث اس نے خود اس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے، اس لیے یہ تو ممکن نہیں کہ گذشتہ صحف سماوی کی طرح اس کتاب میں بھی لفظی تحریفات ہو جاتیں لیکن اس کے علاوہ اور کوئی ظلم اور خیانت ایسی نہیں ہے جو دوسری امتوں نے اپنے صحیفوں کے ساتھ روا رکھی ہو

اور مسلمان اس سے باز رہے ہوں۔ عملی طور پر انھوں نے قرآن کے ایک حصہ کو فراموش کر دیا ہے، اصل زندگی میں اس کو آگے رکھنے کے بجائے پیٹھ پیچھے رکھ چھوڑا ہے اور کچھ اقرار اور کچھ انکار کی روش پر پورے اطمینان کے ساتھ چلے جا رہے ہیں اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ قدرت فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ اور فَنَبَذُوْهُ وَرَاءَ ظُهُوْرِهِمْ نیز اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ کا الزام، ایک محدود معنی میں سہی، ان پر عائد کرے اور اس انجام تک نہ پہنچائے جو اس کا قانون چاہتا ہے۔

شاہراہ نجات اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت حال کا علاج کیا ہے اور اس ملت نے اپنے آپ کو آگ کے جس گڑھے میں لا ڈالا ہے اس سے نکلنے کی سبیل کونسی ہے؟ اس سوال کا حل بھی ہم کو اسی کتاب کا قبول کرنا چاہیے جس کو ہم سچی ہدایت اور یقینی علوم کا تنہا منبع قرار دیتے ہیں اور جس کی ہر بات کو بلا چون وچرا تسلیم کرنے کا ہم نے عہد کیا ہے۔

جس وقت یہ کتاب نازل ہو رہی تھی، اس وقت پرانی آسمانی کتابوں کے پیرو، یہود و نصاریٰ، کچھ اسی قسم کے حالات سے دوچار تھے، جیسا کہ اوپر کے اجمالی اشارات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جب اس نے ان کی گمراہیوں اور اعتقادی و عملی بے عنوانیوں، نیز ان کے نتائج بد کا تفصیلی ذکر کیا تو ان کی رگوں میں جاہلی حمیت کی آگ بھڑک اٹھی اور ضد میں آکر انھوں نے صدائے حق کے استیصال و ابطال کی کوششیں شروع کر دیں۔ سیاسی اور جنگی کوششوں کے علاوہ مناظروں اور مجادلوں کے معرکے بھی گرم کرنے لگے۔ ان تمام ہنگاموں کے پیچھے کچھ تو جاہلی عصبیت اور جوش عناد کار فرما تھا اور کچھ آسمانی مذاہب رکھنے کا ناز بے جا اور ابناء اللہ اور احباء اللہ ہونے کا فریب نفس۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بے اصل دعاوی اور ان کی کٹ حجتیوں کے جواب میں فرمایا:-

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (مائدہ: ۱۰)

اے پیغمبر ان لوگوں سے صاف کہدو کہ اے اہل کتاب! تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ تم توراۃ اور انجیل کو اور جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر اترا ہے، قائم نہ کرو

یعنی تم اپنی موجودہ پوزیشن میں رہتے ہوئے ہرگز اس امر کے مستحق نہیں ہو کہ دلیل و برہان کے ساتھ دعوت حق کے بارے میں کلام کر سکو، تم نے وہ بنیاد ہی کھود کر پھینک رکھی ہے جس پر تمہارے وجود ملی کی عمارت کھڑی تھی۔ اس معاملہ میں تم بحث و جدال کے حقدار اسی وقت ہو سکتے ہو جب تم ان تمام ہدایات پر کاربند ہو جاؤ اور اپنی زندگیوں کو ان تمام احکام کا پابند بنا دو جو سلطان حقیقی کی جانب سے تم پر مختلف وقتوں میں نازل ہوتے رہے ہیں۔ تم نے کتاب الٰہی کے جن حصوں کو اپنی دنیائے عمل سے خارج کر رکھا ہے، ان کو نافذ کرو، جن اصول و مقاصد کو تمہارے سامنے رکھا گیا تھا، ان پر جم جاؤ، اور دین کی جن صداقتوں کا تمہیں علم دیا گیا تھا، ان کی حفاظت و بقا اور تبیین و اشاعت کا بھولا ہوا فریضہ یاد کر لو۔

پھر اس دینی و دنیوی ہلاکت سے جس کو ان لوگوں نے اپنی بدکرداریوں اور غلط کاریوں کے عوض خرید رکھا تھا، نجات کی جو شاہراہ قرآن نے تجویز کی وہ یہ تھی:-

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ

اگر یہ اہل کتاب ایمان رکھتے اور خدا ترسی کی راہ چلتے تو ہم ان کی

سَیِّاٰتِھِمْ وَلَاَدْخَلْنٰھُمْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ۝ وَلَوْ اَنَّھُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْھِمْ مِّنْ رَّبِّھِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِھِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِھِمْ

(مائدہ - ۱۰)

برائیاں ان سے محو کردیتے اور نعمت بھری جنتوں میں ان کو داخل کرتے اور اگر وہ تورات اور انجیل اور ان (ہدایتوں اور کتابوں) کو جو ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی تھیں، قائم رکھتے تو ضرور ایسا ہوتا کہ ان کے اوپر سے بھی رزق برستا اور نیچے سے بھی ابلتا۔

مرض کی یکسانی چاہتی ہے کہ علاج بھی ایک ہی ہو۔ ہلاکت و نامرادی جس راہ سے اہل کتاب کے یہاں آئی تھی، آپ نے دیکھا کہ اہل قرآن کے یہاں بھی اسی راہ سے آئی۔ اس لیے ضرور ہے کہ اس سے نجات بھی اسی طریقہ سے حاصل کی جائے جس کی اہل کتاب کو تلقین کی گئی تھی۔ قرآن کہتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کی بات کے سامنے کسی اور کی رائے سننے اور ماننے کے ہم مجاز نہیں ـــــ کہ اہل کتاب نے کتب الٰہی کے کچھ حصوں کو ترک اور فراموش کردیا، جس کا نتیجہ، رحمتِ الٰہی سے بُعد اور غضب الٰہی کے نزول کی شکل میں نمودار ہوا، جس سے بچاؤ کی واحد شاہراہ انہی کتابوں کا "قائم" کرنا تھا اور اب اس قرآن کو ماننے اور "قائم" کرنے میں ہے۔ اگر ہمارے دل و دماغ قرآن حکیم کے اشارات سمجھنے کی صلاحیتوں سے بالکل محروم نہیں ہوچکے ہیں، تو ہمارے لیے اس پیغام کا سمجھ لینا چنداں دشوار نہیں جو اس کے اس کھلے ہوئے اشارے میں موجود ہے۔ جس کسی کو اللہ تعالیٰ نے گوشِ عبرت بخشا ہے وہ قرآن کے انہی لفظوں میں سے یہ آواز بھی سن سکتا ہے کہ:۔

"اگر قرآن کے پیرو ایمان رکھتے اور خدا ترسی کی راہ چلتے تو ہم ان کی برائیاں ان سے محو کردیتے اور نعمت بھری جنتوں میں ان کو داخل کرتے۔ اور اگر وہ قرآن کو قائم کرتے تو ضرور ایسا ہوتا کہ ان کے اوپر سے بھی رزق برستا اور نیچے سے بھی ابلتا۔"

نیز :۔

"اے اہل قرآن! تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ قرآن کو "قائم" نہ کرو۔"

"قائم کردینے" یا اقامت کے لفظی معنی ہیں سیدھا کرنے اور کھڑا کرنے کے۔ جب جسمی اشیاء کے لیے اس لفظ کا استعمال ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس کی کجی دور کرکے اس کو سیدھا بنادیا یا اس کو کھڑا کردیا، لیکن جب معانی کیلیے اس کا استعمال ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس چیز کو کامل اعتنا کے ساتھ اس کی مکمل ترین اور حسین ترین شکل میں اس طرح پورا کردیا جائے جیسا کہ اس کا حق ہے۔ بازار کی "اقامت" کا مفہوم یہ ہے کہ اس کو اس تمام ضروری ساز و سامان اور حسن انتظام سے مالا مال کردیا جائے جس کا بازار میں ہونا ممکن ہے۔ نماز کی اقامت کا مطلب یہ ہے کہ دوامًا اس کو ظاہری آداب اور باطنی محاسن سے اس طرح آراستہ رکھا جائے کہ کہیں کوئی نقص نہ باقی رہے اور نماز کا جو مقصود ہے وہ پورا پورا حاصل ہوجائے۔ پس اقامت قرآن کا مدعا یہ ہوا کہ اس کے جتنے احکام ہیں، سب کے سب نافذ ہوں، اس کے جتنے اصول ہیں ان سب کو اور صرف انہی کو مدار زندگی بنالیا جائے، اس کی کسی ہدایت سے بال برابر بھی انحراف نہ کیا جائے، زندگی کے ہر مرحلہ میں، ہر شعبہ میں، ہر معاملہ میں صرف وہی نقطۂ نظر اختیار کیا جائے جو اس نے دیا ہے۔ اور پوری سوسائٹی پر وہ رنگ چھا جائے جو وہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس طرح پر کہ دیکھنے والوں کو یہ پورا ماحول قرآنی اور یہ پوری سوسائٹی ایک متحرک قرآن کی صورت میں نظر آئے۔ اسی کا نام اقامت قرآن ہے جس کو ہم اقامت دین بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ

جو کچھ قرآن میں ہے اسی کے مجموعہ کا نام دین ہے۔ اس لیے اقامت قرآن اور اقامت دین در اصل ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔

پس اقامت قرآن یا اقامت دین ہی وہ واحد نسخۂ شفا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس امت کے آنے والے امراض کو دور کرنے کی خاطر پہلے ہی سے تجویز فرما دیا تھا، اور یہ بتا دیا تھا کہ یہی وہ شے ہے جس پر تمہاری دنیوی فلاح، تمہاری اخروی سعادت اور تمہارے ملی تشخص، ان تینوں چیزوں کا انحصار ہے۔ تم کو جب بھی ان چیزوں کی تلاش ہو، اس کے لیے یہی راستہ اختیار کرنا۔ ورنہ باقی ہر طرف سراب ہی سراب ہے، جہاں سوائے حیرانی اور سرگشتگی کے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ گویا پھر اسی مقام پر واپس جانے کا حکم دیا ہے جہاں سے ہم ہٹ آئے ہیں۔ اس لیے کہ پہلے بھی تو یہی اقامت دین ہماری زندگی کا تنہا وظیفہ تھا، چنانچہ کہا گیا تھا کہ:-

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ..... ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (روم-۴)   سو تو اپنے رخ کو یکسو ہو کر دین (اسلام) کی طرف سیدھا کر..... یہی سیدھا دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

یہ خطاب پیغمبر کی طرف، اور اس کے توسط سے ایک ایک فردِ امت کی طرف ہے۔ اس میں واضح طور پر مطالبہ کیا گیا ہے کہ ہر ایک قانون، ہر ایک ضابطہ اور ہر ایک طرز زندگی سے منہ موڑ کر اپنی تمام اطاعتوں کو اسی ایک طریق حیات یعنی دین اسلام کے لیے مخصوص کر دو اور دنیا میں اس طرح زندگی بسر کرو کہ ہر لمحہ تمہاری نگاہیں اسی دین کے اشاروں پر لگی رہیں اور تمہارا رخ اسی دین کے احکام و مطالبات کی طرف متوجہ رہے۔

پھر اس امت کے وجود کی غایت، جو ایسے افراد پر مشتمل ہو، یہ بتائی گئی تھی کہ:-

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (بقرہ-۱۷)   اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک عادل اور متوسط امت بنایا ہے تاکہ تم لوگوں کے لیے (حق کے) گواہ ہو۔

یعنی اس حق پر جو پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے، صرف اپنے طور پر عمل کر لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ تمام لوگوں کے سامنے اپنی زبان اور اپنے عمل اور بوقت ضرورت اپنے مال و جان سے اس حق کی گواہی دینا تمہارا فرض منصبی ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا گیا ہے کہ:-

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ۔   تم وہ بہترین امت ہو جو تمام نوع انسانی کے لیے ظہور میں لائی گئی ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

معلوم ہوا کہ اس امت کا مقصد حیات اور اس کا نصب العین صرف یہی متعین کیا گیا تھا کہ وہ تمام اقوام عالم کو حق کی طرف بلائے، معروف کو پھیلائے، نہ صرف پھیلائے بلکہ بزورِ حکم اسے نافذ کرے اور بدی کے خلاف نہ صرف وعظ و تلقین کرے بلکہ اسے حکماً روک دے جس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ زمین پر خدا کے دین کو قائم اور سب کو اسی کا محکوم بنا دے۔ کیونکہ جس "حق" کا گواہ بنا کر اسے بھیجا گیا ہے وہ اسی "دین حق" کا نام ہے اور جس "معروف" کے نافذ کرنے کا اس کو حکم دیا گیا ہے وہ انہی اوامر کا نام ہے جو قرآن و سنت میں مذکور ہیں یا ان کے الفاظ سے مستنبط ہوتے ہیں اور جس منکر کے استیصال

کی ذمہ داری اس کے سپرد کی گئی ہے اس میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جو احکام و شرائع دینی کے خلاف اور مزاج شریعت کے ناموافق ہیں۔

مقصد حیات اور نصب العین کی اس تعیین کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اس امت کو جو عروج و اقبال بھی بخشا گیا تھا وہ اسی نصب العین سے وفاداری کا صلہ تھا، اور اس سے اللہ تعالیٰ نے فتح و نصرت کے جتنے وعدے کیے تھے وہ سب اسی اقامت دین کی شرط سے مشروط تھے۔ چنانچہ جب مسلمانوں کو یہ بشارت دی گئی کہ تم ہی سربلند ہوگے اور تمہارے مقابلہ میں تمہارے اعداء کا انجام شکست اور محکومیت ہوگا تو اسی کے ساتھ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ کی شرط بھی لگا دی گئی تھی۔ یہ مشروط وعدہ ہنگامی نہیں بلکہ ابدی تھا جس کی شہادت اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے متعلق پیشگوئی فرماتے ہوئے کہا تھا کہ الائمۃ من القریش ما اقاموا الدین (خلفا قریش میں سے ہوتے رہیں گے جب تک کہ وہ دین کو قائم رکھنے کا فرض ادا کرتے رہیں)

اس ساری بحث سے چند باتیں ثابت ہوتی ہیں:۔

اولاً یہ کہ اس امت کا نصب العین اللہ کے دین کی اقامت تھا، ثانیاً یہ کہ اس فریضہ کو انجام دینے پر اللہ تعالیٰ کی غیبی اعانتیں اس کے شامل حال ہوئیں اور وہ دنیا میں بے مثل قوت و اقبال سے سرفراز ہوئی۔ ثالثاً یہ کہ اس امت کے عروج و زوال کا انحصار محض طبعی اسباب و قوانین پر نہیں ہے، بلکہ اخلاقی قوانین پر، یعنی اس فرض ہی کے بجا لانے پر ہے جو اس کے وجود کا تنہا مقصود ہے، اگر اس نے اس فرض سے پہلو تہی کیا تو دوسری اقوام کی بہ نسبت وہ اللہ کے دربار سے دوگنی سزا کی مستحق ہوگی۔ رابعاً یہ کہ اس امت کے موجودہ حالات، کتاب اللہ کو عملاً ترک اور فراموش کر دینے اور اقامت دین کے فرض سے بالکل غافل ہو جانے پر دلالت کرتے ہیں۔ خامساً یہ کہ از روئے قرآن اس امت کی موجودہ ذلت و نکبت کا علاج اپنے فرض کو دوبارہ پہچان لینے اور اللہ کی کتاب یعنی اللہ کے دین کو از سرِ نو قائم کر دینے میں ہے۔ سادساً یہ کہ اگر اس امت نے اپنی موجودہ شکست، درماندگی اور ذلت و محکومی کو دور کرنے کے لیے اقامت دین کی راہ سے الگ کوئی راہ اختیار کی تو اس کی تمام تدبیریں اور کوششیں نہ صرف یہ کہ ضائع جائیں گی بلکہ اس کو زندگی کی عظمتوں اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے اور دور پھینک دیں گی اور وہ دوسری اقوام کے مقابلہ میں، دین کا سررشتہ چھوڑ کر اور اس کی اقامت کا فریضہ فراموش کر کے، کبھی بھی گوئے سبقت نہیں لے جا سکتی۔ اور اگر بظاہر کوئی سربلندی اس کو ملے گی بھی تو غیروں کا عطیہ ہوگی جس کا وجود بھی غیروں کے رحم و کرم پر ہوگا اور یہ بجائے خود ایک بڑی ذلت ہے۔

فرض ناشناسی اور حقائق سے چشم پوشی

ان حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے ایک ایسے شخص کے لیے جو اللہ اور اس کے رسول اور قرآن پر ایمان رکھتا ہو، جو مسلمان جینا اور مسلمان ہی مرنا چاہتا ہو اور جس کو کل قیامت کے دن اپنے اعمال کی جوابدہی کا پورا احساس ہو، اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ ہر طرف سے اپنی آنکھیں پھیر کر، ہر آواز کے لیے اپنے کان بند کر کے، ہر تسویل نفس اور ہر وسوسۂ شیطانی سے دل کو پاک کر کے اور سود و زیاں کے تمام اندیشوں سے بے پروا ہو کر اس صراط مستقیم اور اس شاہراہ نجات پر اپنے قدم مضبوطی سے جما لے اور اپنے جسم و دماغ کی ساری قوتیں اس

دینِ حق کے قائم کردینے میں لگا دے۔ وہ اپنے فہم و تدبر سے کام لے کر اس کے لیے مناسب وقت تدبیریں سوچ سکتا ہے، حالات زمانہ کے لحاظ سے ایک خاص طریقۂ عمل اختیار کر سکتا ہے، ماحول کے تقاضے سے کوئی مخصوص پالیسی مرتب کر سکتا ہے لیکن اپنے اس نصب العین اور مقصدِ زندگی میں ترمیم کرنا یا اس کو ملتوی کر دینا اس کے اختیار سے باہر ہے۔ وہ اس راہ سے ہٹ کر اور اس نصب العین کو چھوڑ کر جو قدم بھی اٹھائے گا وہ اللہ اور اس کے رسول سے بغاوت کا قدم ہوگا۔ اس وقت اس کی مثال اس نادان اندھے کی سی ہوگی جو کسی گہرے کھڈ کی طرف بڑھ رہا ہو اور اس کا خیر خواہ رہبر چلا چلا کر ادھر جانے سے منع کر رہا اور صحیح راہ پر لانے کی کوشش کر رہا ہو مگر وہ ہے کہ ایک طرف تو وہ اپنے اس رہبر کی باخبری، اس کی راست گوئی، اس کی خیر خواہی اور اس کے خلوص کا قصیدہ پڑھ رہا ہے اور ساتھ ہی دوسری طرف اسی سمت بڑھے جانے پر اصرار کر رہا ہے۔ محض اس بنا پر کہ اس سمت کی زمین اسے کچھ ڈھلوان معلوم ہو رہی ہے جس پر قدم آسانی کے ساتھ پڑتے جا رہے ہیں۔ اور اس کی مخالف سمت کی زمین کچھ بلند محسوس ہوتی ہے جس پر قدم رکھنے میں چڑھائی کی دقتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔

لیکن بدقسمتی سے آج یہ پوری امت بالکل اسی اندھے کا پارٹ ادا کر رہی ہے۔ وہ ہر اس سمت دوڑ پڑنے کے لیے تیار ہے جس پر کسی قوم کو سرگرم سفر دیکھ پائے۔ صرف اس وجہ سے کہ اس کو یہ راہ بظاہر سہل اور ہموار اور دل کش نظر آتی ہے گرچہ وہ ٹھیک ہلاکت و نامرادی کی جہنم تک منتہی ہوتی ہو۔ اگر کسی سمت اس کے اقدام اٹھنے سے انکار کرتے ہیں تو وہ وہی سمت ہے جو اقامت دین کی سمت کہلاتی ہے۔ اس لیے کہ یہ راہ مشکلات کے کانٹوں سے بھری ہوئی دکھائی پڑتی ہے۔ قرآن اس کو ہلاکت کی تمام راہوں سے روک کر اسی ایک راہ کی طرف بلاتا ہے مگر وہ سنی ان سنی کر دیتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ میں ہی تیرا بہی خواہ ہوں، وہ جواب دیتی ہے کہ یہی تو ہمارا ایمان ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ میں ہی تیرا ہادی اور نجات دہندہ ہوں، وہ جواب دیتی ہے، اس سے کس کافر کو انکار ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا، کبھی غلط بات نہیں کہتا، کبھی اپنے دعاوی کی بنیاد وہم و گمان اور خرص و تخمین پر نہیں رکھتا، وہ جواب دیتی ہے کہ لاریب! قرآن کہتا ہے کہ میرے پاس اور صرف میرے ہی پاس علمِ حقیقت ہے۔ میں ہمیشہ صحیح راہ بتاتا ہوں، نجاتِ انسانی کا راز صرف میری تعلیمات میں مضمر ہے، وہ جواب دیتی ہے کہ بلاشبہ! قرآن کہتا ہے کہ جو کچھ میرے سوا ہے، وہ سب باطل ہے، جو میرے خلاف ہے وہ سراسر جہل ہے، جو مجھ سے ہم آہنگ نہیں اس میں تباہی و نامرادی کے علاوہ کچھ نہیں، وہ جواب دیتی ہے کہ بالیقین! ــــ لیکن جب وہ کہتا ہے کہ تیرے لیے میرے پاس صرف ایک پیام ہے، اقامتِ دین کا پیام، تو اس کی زبان، جو ابتک اس کے ہر دعوے کی تصدیق کرنے میں اتنی تیز تھی، معاً بند ہو جاتی ہے۔ اور اس کی جگہ اس کا دماغ حیلوں اور تاویلوں کا ایک لشکر تیار کر کے سامنے آ جاتا ہے تاکہ اس اضطراب کو کچل ڈالے جو اس منافقانہ خاموشی کے باعث اس کی روح کی گہرائیوں میں رونما ہوتا ہے۔ مجرم انسان، اگر اس کے اندر غیرت اور عزتِ نفس کی کوئی رمق باقی ہو، لوگوں کے سامنے مجرم کی حیثیت سے آنا کبھی گوارا نہیں کرتا۔ یا تو اس غیرت اور عزتِ نفس کی بیدار حس اس کو مجبور کر دیتی ہے کہ اپنے اس جرم کا کفارہ ادا

کرے اور اپنے عمل کے ذریعہ اپنے دامن سے اس داغ کو دھو دے، یا پھر اس حس کے کمزور ہونے کی شکل میں، اس کی تمام دماغی قابلیتیں اس بات پر صرف ہونے لگتی ہیں کہ کسی طرح اس جرم کو عین حق اور صواب ثابت کر دے۔ اس وقت اس کا نفس اس کو بے گناہی کا فریب دینے میں ہمہ تن مشغول ہو جاتا ہے اور اس کے حکم سے اس کا دماغ تاویلوں کا ایک خوشنما نقاب تیار کر دیتا ہے جس کو وہ اپنے چہرے پر ڈال کر اپنے آپ کو یہ محسوس کرا لیتا ہے کہ میں برسرِ حق ہوں۔ اس کے بعد اس کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ ساری دنیا کو ایسا ہی محسوس کرا دے، تاکہ اس کے داغِ گناہ کی طرف کوئی انگلی اٹھانے والا نہ رہ جائے۔

قرآن کی علم بردار اور دین اسلام کی پیروی کا دم بھرنے والی امت اپنے فریضۂ ملی اور مقصدِ زندگی کی بجا آوری میں کچھ اسی قسم کے مجرمانہ ادعائے بیگناہی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ صدیوں کے انحطاط اور زوال نے اس کے احساسِ خودی کو بری طرح مجروح کر ڈالا اور ان جذبات عزم و ہمت سے سینوں کو ویران کر دیا ہے جو ایک نصب العین کی اقامت کے لیے ضروری ہیں۔ اور نصب العین بھی اقامت دین کا نصب العین، جو کبھی بھی آسان نہ تھا اور جس میں جان و مال کی بازی، عیش و آرام کی قربانی اور امیدوں اور تمناؤں کی پامالی شرطِ اول قدم ہے۔ اس کے بجائے اس کے کہ وہ اپنے جرم کو تسلیم کر کے تلافی مافات کی کوشش کرتی اور اپنی ذمہ داریوں کا بار اٹھا لیتی، سرے سے اپنی کوئی ذمہ داری ہی نہیں تسلیم کرنا چاہتی، اور طرح طرح کی دور از کار تاویلوں سے اپنے رہے سہے احساس فرض کو دبا رہی ہے

گریز کی راہیں آیئے ان تاویلوں کی یا ان کے پیش کرنے والوں کے بقول ان محکم دلائل کی حیثیت اور حقیقت پر غور کریں جو اس ترکِ فرض کے جواز میں پیش کی جاتی ہیں۔

ایک گروہ کا کہنا یہ ہے کہ ایک ایماندار اور صداقت شعار انسان کے لیے پورے قرآن پر عمل کرنا کسی حال میں بھی ناممکن نہیں، اور جن کو اللہ نے حسن عمل اور خشیت و انابت کی توفیق بخشی ہے وہ آج بھی پورے دین پر عامل ہیں اور دوسروں کو بھی "امر بالمعروف" کرتے رہتے ہیں۔ رہ گئے قرآن کے وہ احکام جن کا تم نے اوپر حوالہ دیا ہے، ان کا تعلق حکومت اسلامی سے ہے اور ان کے مخاطب مسلمانوں کے اولو الامر ہیں، عوام نہیں ہیں اس وقت چونکہ اسلامی حکومت قائم نہیں اس لیے ان احکام کے اجرا و نفاذ کی ذمہ داریوں کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اور اگر کچھ اوامر ایسے ہیں بھی جن کا تعلق براہ راست عامۃ المسلمین سے ہے، لیکن جن پر عمل نہیں ہو رہا ہے مثلاً تحاکم الی الطاغوت اور حکم بامر الطاغوت وغیرہ سے اجتناب تو ایسا وہ اضطراراً کر رہے ہیں اور بحالت اضطرار ممنوعات بھی مباح ہو جاتے ہیں۔ اس لیے قرآن کے ایک حصہ کو ترک یا فراموش کر دینے کا الزام سراپا بہتان ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ بلاشبہ از روئے کتاب و سنت ملت اسلامیہ کا فرض یہی ہے، لیکن موجودہ ناسازگار حالات میں اس نصب العین کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں، اس لیے اس وقت اس کے لیے جد و جہد کرنا وقت اور قوت کو

ضائع کرنا ہے۔ اور اس کا اعلان و اظہار کرنا نہ صرف مصلحت کے خلاف اور عدمِ تدبر کی دلیل ہے بلکہ عافیت کے لیے سراسر مضر اور مہلک ہے۔ اس لیے سردست کچھ ایسی دوسری تجاویز اختیار کی جائیں جو ممکن العمل ہوں اور تجربات سے مفید ثابت ہو چکی ہوں اور جو ساتھ ہی آگے چل کر ہمارے اصلی مشن کے لیے حالات نسبتاً کچھ زیادہ سازگار کر دیں اس وقت اس کے لیے براہِ راست جد و جہد شروع کی جائے گی۔

ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو صفائی کے ساتھ اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ نصب العین بالکل برحق ہے مگر ہم صدیقؓ اور فاروقؓ نہیں ہو سکتے، ہم جیسے کمزور لوگوں کے بس کا یہ کام نہیں ہے۔ جس مشن کو پیغمبر کی تربیت یافتہ جماعت بھی تیس برس سے زیادہ نہ چلا سکی اس کے لیے ہم جیسے ضعیف الایمان لوگوں کا دم خم دکھانا تقدیر سے لڑنا ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں آسکتا جو تیرہ سو برس پہلے گزر چکا۔

کچھ لوگ ایسے ہیں جو تربص کی راہ پر گامزن ہیں۔ ان کو ملت کی موجودہ اجتماعی معصیت اور اس کے واحد نصب العین سے انکار نہیں، مگر پہلے وہ دیکھنا یہ چاہتے ہیں کہ اس نصب العین کے داعی اور مبلغ عمل کے میدان میں کتنی تیز گامی اور ثباتِ قدمی دکھاتے ہیں۔ چونکہ انھیں اس امر میں شک ہے کہ آزمائشوں کے وقت یہ اقامتِ دین کے مدعی میدان میں جمے رہیں گے، اس لیے ان کے لیے اس جد و جہد میں شریک ہونے کا ابھی کوئی سوال نہیں۔

ایک بہت بڑا گروہ حضرت امام مہدی کے ظہور کا منتظر ہے، اس کو اس نصب العین کے برحق ہونے کا پورا یقین ہے مگر اس کا خیال یہ ہے کہ اس کے مکلف ہم نہیں ہیں، اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے امام مہدی کے بھیجنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس لیے ہم کو خواہ مخواہ یہ دردِ سر نہیں خریدنا چاہیے۔

یہ سارے گروہ اور ان کے یہ خیالات مسلمانوں کے ان طبقوں اور حلقوں سے تعلق رکھتے ہیں جو مذہبی اور دیندار حلقے کہے جاتے ہیں۔ رہ گیا وہ گروہ جو دین کے حلقہ کو اپنی گردن سے اتار کر پھینک چکا ہے اور جو اپنے مسائلِ زندگی میں قرآن و سنت کو اتھارٹی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں، تو اس کے خیالات سے ہم اس وقت تعرض نہیں کرنا چاہتے۔ ہمارے مخاطب اس وقت صرف وہ لوگ ہیں جو کتاب اللہ اور سنتِ رسول کے فیصلہ کو آخری فیصلہ مانتے ہیں اور جن کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنے معاملات و مسائل میں شریعت کی ہدایات اور احکام کے سوا کسی اور حجت اور سند کے محتاج نہیں۔

باطل کے ساتھ اسلام کا طرزِ عمل

لیکن اس لمبی بحث کو شروع کرنے اور ان افکارِ پریشاں پر تبصرہ کرنے سے پہلے اسلام کی ایک اصولی ہدایت ذہن نشین کر لینی چاہیے جو ہماری زندگی کے ہر مرحلہ اور ہر موڑ پر دلیلِ راہ کا کام دیتی ہے اور التباسِ حق و باطل کے تاریک سے تاریک مواقع میں بھی اسلام کی صراطِ مستقیم آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی۔ اس اصولی ہدایت کو سمجھ لینے سے اس بحث کی بے شمار الجھنیں خود بخود دور ہو جائیں گی۔ اسلام نے ہم کو حق کی پیروی اور باطل سے اجتناب کا حکم دینے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ہمارے فرائض میں یہ چیز بھی شامل کی ہے کہ:-

لتامرن بالمعروف ولتنهن عن المنكر ولتاخذن على يد المسئ ولتاطرنه على الحق

تم ضرور معروف کا حکم دیتے رہنا اور بدی سے روکتے رہنا، بدکار کا ہاتھ پکڑ لینا اور اس کو حق کی طرف موڑ دینا۔

اور اگر اس فریضہ کو نہ ادا کیا گیا تو اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس سے بھی خبردار کر دیا گیا ہے۔

اولیضربن اللہ قلوب بعضکم علی بعض ولیلعنکم کما لعنھم (ترمذی) — ورنہ اللہ تعالیٰ باطل پرستوں اور بدکاروں کے دلوں کا زنگ معصیت حق پرستوں کے دلوں پر بھی چڑھا دے گا یا تم پر اسی طرح لعنت کر دے گا

ایک دوسری حدیث میں اس نہی عن المنکر کے طریق کار کی تشریح اس طرح کی گئی ہے۔

من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ فان لم یستطع فبقلبہ ولیس وراء ذالک حبۃ خردل من الایمان — تم میں جو کوئی بدی کو دیکھے تو چاہیے کہ اسے ہاتھ سے مٹا دے اور اگر ایسا نہ کر سکتا ہو تو زبان سے، اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو دل سے۔ اس کے بعد ذرہ برابر بھی ایمان کا درجہ نہیں۔

ان ارشادات میں ہم کو اپنی حیات ایمانی کے چند اساسی اصول ملتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ منکر سے بچنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کا استیصال کرتے رہنا بھی ایک فریضہ دائمی ہے۔ دوسرے یہ کہ منکر کو برداشت کرنا۔ اس سے رغبت رکھنا نہیں بلکہ اس کو برداشت کر لینا ہی اجتماعی ہلاکت کے خطرہ کا الارم ہے۔ تیسرے یہ کہ اگر کسی شخص کے دل میں منکر سے نفرت اور اس کو حق سے بدل ڈالنے کی تڑپ نہیں تو وہ ایمان سے بے بہرہ ہے۔

اب ہم ترتیب وار ہر گروہ کے خیالات اور دلائل کو اصول و نصوص کی میزان میں تولنا چاہتے ہیں تاکہ ان کا صحیح وزن معلوم ہو سکے اور نگاہوں کے سامنے سے وہ پردہ اٹھ جائے جس کو سہولت پسندی اور ضعف عزم اور قلت احساس فرض کے ہاتھوں نے حقیقت کے چہرے پر ڈال رکھا ہے۔

(۱) **کیا موجودہ عمل بالقرآن کافی ہے؟** اس امر کا دعویٰ تو کوئی بھی نہیں کر سکتا کہ قرآن و سنت میں صرف نماز، روزے، حج اور زکوٰۃ ہی کے فرائض کا ذکر ہے اور مومن سے انہی احکام کی بجا آوری کا مطالبہ کیا گیا ہے یا ان کے ماسوا جو احکام ہیں وہ نعوذ باللہ محض "بھرتی کے مضامین" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ ان میں علمی طور پر جو فرق مراتب چاہیں قائم کر لیں اور ان کے اجر و ثواب میں بھی باہم جو نسبت چاہیں متعین کر لیں، لیکن عملی طور پر کسی تفریق کے نہ آپ حقدار ہیں اور نہ اس کی کوئی ضرورت ہے۔ ایک غلام کا فرض اپنے آقا کے ہر چھوٹے بڑے حکم کی تعمیل ہے۔ اس کو یہ حق کبھی نہیں پہنچتا کہ ضروری اور غیر ضروری کی بحث پیدا کر کے بعض احکام کو تو مانے اور بعض سے اغماض کر جائے۔ آقا کا حکم بہرحال حکم ہے جو ہر صورت میں پورا ہونا چاہیے۔ آپ نے بھی اللہ تعالیٰ کی کامل بندگی اور ہمہ وقتی غلامی کا عہد کیا ہے۔ اب (بطور مثال) اس آقا کی طرف سے دو حکم آتے ہیں ایک تو یہ کہ نماز پڑھو، دوسرے یہ کہ چور کا ہاتھ کاٹ دو۔ اگر آپ ان میں سے پہلے حکم پر عمل کرتے ہیں اور دوسرے کو سن کر خاموش ہو رہتے ہیں تو آپ اپنے اس طرز عمل کو آقا کی کامل اطاعت اور اس کی کتاب الاحکام — قرآن — کی پوری پابندی کہہ سکتے ہیں؟ پھر یہ کیا ستم ہے کہ قرآن کے ایک دو نہیں بیسیوں احکام بالکلیہ متروک و مہجور ہو کر رہ گئے ہیں اور پھر بھی آپ کو خوش فہمی ہے کہ ہم عمل بالقرآن کے مطالبہ سے پوری طرح عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔ آخر ایک مومن کا ضمیر اپنے فرض کی ادائگی پر کس طرح مطمئن ہو جاتا ہے جبکہ وہ اپنے اوپر اور اپنے گرد و پیش غیر اللہ کا تخت خداوندی بچھا ہوا پاتا ہے اور معبود حقیقی کے بے شمار احکام کو معطل اور اس کی قائم کی

ہوئی حدود کو ٹوٹتے ہوئے دیکھتا ہے لیکن اس طاغوتی خداوندی کے تخت کو الٹ دینے، معطل شدہ احکام الٰہی کو نافذ کر دینے اور حدود اللہ کے توڑنے والوں پر ان تعزیرات کے جاری کرنے کا عزم اس کو ادائے فرض پر آمادہ یا کم از کم بے چین نہیں کر دیتا جن کے جاری کرنے کا حکم اسے ملا ہے۔

عذرگناہ اس کے جواب میں جو عذر پیش کیے جاتے ہیں وہ عذر گناہ بدتر از گناہ کے شاہکار ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہم تو ان احکام کے سرے سے مکلف و مخاطب ہی نہیں، ان کے نفاذ کی ذمہ داری تو مسلمانوں کے اولوالامر پر ہے۔ آج چونکہ اسلامی حکومت موجود نہیں اس لیے ان احکام کی تکلیف ہی ساقط ہو گئی ہے۔ حالانکہ قرآن میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اے مسلمانوں کے اولوالامر! تم چور کے ہاتھ کاٹ دو یا زانی کو کوڑے مارو بلکہ فَاقْطَعُوْا، فَاجْلِدُوْا وغیرہ کے الفاظ آتے ہیں جن کے مخاطب سارے اہل ایمان ہیں۔[۵۱] اور جن پر عمل کرنے کی اصل ذمہ داری پوری امت مسلمہ پر ہے نہ کہ کسی خاص فرد یا چند افراد پر۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ ان قوانین کا اجراء اولوالامر ہی کریں گے کیونکہ نظم مملکت کا تقاضا یہی ہے۔ اس کے بغیر حکومت کا کاروبار چل ہی نہیں سکتا، مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہی اولوالامر ان احکام کے مخاطب اول ہیں، نہیں، مخاطب اول تو پوری جماعت ہے اور یہ اولوالامر جماعت کے نمائندوں کی حیثیت سے ان کا نفاذ کرتے ہیں۔ پس جب جماعت کے یہ نمائندے موجود نہ ہوں تو اس ذمہ داری کا رخ آپ سے آپ اپنے مخاطب اول یعنی جماعت کی طرف ہو جاتا ہے۔ گویا ان احکام کی نوعیت فرض کفایہ کی سی ہے کہ اگر اولوالامر کے گروہ نے ان پر عمل کر دیا تو ساری امت کی طرف سے یہ فرض ادا ہو جاتے ہیں، ورنہ، بصورت دگر، پوری جماعت کے سر یہ فرائض رہ جاتے ہیں اور ایک ایک فرد اس ترک امر الٰہی کی پاداش میں ماخوذ ہوگا۔

اس بارے میں اگر کوئی وزنی بات کہی جا سکتی ہے تو وہ صرف یہ کہ ہمارے پاس وہ سیاسی اقتدار کہاں ہے جو ان احکام کے نفاذ کے لیے ضروری ہے۔ یقیناً یہ بات سنجیدہ غور و فکر کی محتاج ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ایسے احکام کے نفاذ کے سلسلہ میں گرچہ اصل مخاطب اور ذمہ دار پوری جماعت ہے مگر ان کا نفاذ جب ہوگا تو ایک قوت قاہرہ یعنی حکومت ہی کے ذریعہ ہوگا۔ افراد کو اس کا اختیار نہیں دیا جا سکتا ورنہ اگر ہر فرد بجائے خود اس فرض کو ذاتی طور پر انجام دینے لگے تو زمین فتنہ و فساد سے بھر جائے اور اجتماعی زندگی تباہ اور نظم جماعت پارہ پارہ ہو جائے۔ اس لیے ایسے احکام کے اجراء یا یوں کہیے کہ قرآن کے ایک بڑے حصہ پر عمل کے لیے سیاسی اقتدار کا وجود ضروری ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس سیاسی اقتدار کے نہ ہونے کی صورت میں ہماری اور آپ کی ذمہ داریوں میں کمی آ جاتی ہے یا وہ اور زیادہ سخت اور گراں ہو جاتی ہیں؟ آیا ہم کو خدا کا "شکر" ادا کر کے اس امر پر اظہار اطمینان کرنا چاہیے کہ

---

[۵۱] چنانچہ اہل تفسیر آیت سرقہ کی تاویل میں فرماتے ہیں:- یقول جل ثناؤہ من سرق من رجل او امرأۃ فاقطعوا ایھا الناس یدہ...... فلا تفرطوا ایھا المؤمنون فی اقامۃ حکمی علی السراق وغیرھم من اھل الجرائم الذین اوجبت علیھم حدودا فی الدنیا۔ یعنی اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ "اے لوگو! جو مرد یا عورت چوری کرے اس کے ہاتھ کاٹ دو...... اے مومنو! چوروں اور ان تمام مجرموں پر جن کے لیے میں نے دنیا میں سزائیں مقرر کر دی ہیں، میرے احکام جاری کرنے میں ذرا بھی کوتاہی نہ کرنا۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۰ پر)

جلو قرآن کے ایک حصہ پر تو عمل کرنے سے آزادی ہوگئی یا اس اقتدار کے حاصل کرنے کی سعی کرنی چاہیے جس کے نہ ہونے کی وجہ سے ہم اپنے پروردگار کے کتنے ہی احکام پر عمل پیرا ہونے کی سعادت سے محروم ہیں؛ نہ صرف سعادت سے محروم ہیں بلکہ اس کی بندگی کا حق ادا کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور کتاب الٰہی کو ترک اور فراموش کرنے کی قدیم سنت ضلال دُہرائی پڑ رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے اپنے دماغ کو منطقیانہ قیل و قال سے پاک کر لیجیے اور اپنے قلب اور ضمیر کی آواز پر کان لگا کر سنیے کہ وہ ان سوالوں کا کیا جواب دے رہے ہیں؛ یقین جانیے جس قلب میں بھی ایمان کی حرارت موجود ہوگی وہ کبھی سکون اور اطمینان کے ساتھ اس صورت حال کو برداشت کرنے کی اجازت نہ دے گا۔ اس لیے ان احکام کو نافذ کرنے والی قوت کے حاصل ہونے کی شکل میں اگر امت پر صرف یہ ایک فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ان کو نافذ کرے تو اس کے حاصل نہ ہونے کی صورت میں اس کی ذمہ داریاں دو چند ہو جاتی ہیں پہلے تو اس قوت کو حاصل کرنا اور پھر ان احکام کو نافذ کرنا یہ اصول کسی بحث کا محتاج نہیں کہ جو چیز کسی فرض کی ادائگی کا ذریعہ یا موقوف علیہ ہوتی ہے، اس کی ادائگی خود فرض ہوتی ہے۔ آپ اس شخص کو ملامت کرنے میں شاید ایک لمحہ بھی توقف نہ کریں گے جو نماز اس عذر سے نہیں پڑھتا کہ اسے قرآن یاد نہیں یا جائے نماز ناپاک ہے، اور فوراً اس پر یہ الزام عائد کر دیں گے کہ یہ اپنا فرض ادا کرنے سے جی چرا رہا ہے اور اس کے دل میں نماز کی کوئی اہمیت اور محبت نہیں، ورنہ ایسا عذر لنگ اور مضحکہ خیز بہانہ نہ کرتا اور دنیا کے سارے کاروبار چھوڑ کر سب سے پہلے قرآن یاد کرنے کی کوشش یا جائے نماز پاک کرنے کی تدبیر کرتا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اوامر قرآنی کے ایک بڑے حصہ کو معطل کر کے آپ صرف اس بنا پر مطمئن بیٹھے ہیں کہ اس کے لیے جس سروسامان کی ضرورت ہے، وہ میسر نہیں۔ اور پھر بھی آپ کی معصومیت اور آپ کے تقویٰ پر آپ کی نگہِ احتساب کوئی حرف نہیں رکھتی اور آپ کو اپنے اس عذر میں کوئی بے وقعتی اور اس بہانہ میں کوئی مضحکہ خیزی نظر نہیں آتی۔ اگر یہ سروسامان میسر نہیں تو کیا آپ کے — بشرطیکہ اپنے عہد کا پاس اور اپنے فرض کا صحیح احساس موجود ہو — یہ دینی فرض نہیں ہو جاتا کہ اپنی ساری قوتیں اور تدبیریں صرف کر کے اس سروسامان کو حاصل کریں؟ خواہ اس کوشش میں آپ کو کیسی ہی مالی اور جانی قربانیاں کیوں نہ دینی پڑیں، اس لیے کہ یہ جان اور یہ مال آپ کی ملکیت نہیں کہ انھیں سینت کر رکھا جائے بلکہ جس روز آپ نے ایمان کا اقرار کیا اسی روز یہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے آپ سے اپنی رضا کے عوض خرید لیں اور اب وہ آپ کے پاس اسی آقائے دوجہاں اور مالک جسم و جان کی امانت ہیں جس نے اپنے اوامر کی بجا آوری کا ہم سے اور آپ سے میثاق لیا ہے، اور یہ امانتیں ہمارے پاس صرف اس غرض سے رکھی ہیں کہ ان اوامر کی بجا آوری میں حسب ضرورت صرف کر دی جائیں۔ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ (اللہ نے مومنوں کی جان اور مال کو جنت کے عوض خرید لیا ہے) پس جو چیز خدا کی خریدی ہوئی اور آپ کے پاس بطور امانت رکھی ہوئی ہے اس کو عند المطالبہ اس کی راہ میں خرچ کرنے سے گریز کرنا بد ترین قسم کا کمینہ پن اور خیانت ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۹) دیکھیے ایک جگہ "فاقطعوا" کے مخاطب حقیقی کی تصریح 'ایھا الناس' کے لفظ سے کی ہے، اور دوسری جگہ "ایھا الذین آمنو" کے لفظ سے، "یا اولی الامر" کہیں نہیں کہا گیا۔ پھر مزید وضاحت یہ کر دی کہ یہ مخاطبت صرف اسی آیت سرقہ میں نہیں ہے بلکہ تمام تعزیرات اسلامی میں یہی اصول کار فرما ہے۔

اور نہیں کہا جاسکتا کہ وہ شخص اپنے اوپر کتنا بڑا ظلم کر رہا ہے جس کے پاس خدا نے اپنی چند امانتیں اس لیے رکھ چھوڑی ہیں کہ جب اس کی اطاعت امر کی راہ میں کوئی مانع پیش آئے تو وہ ان کے ذریعہ اس مانع کو دور کرنے کی سعی و جہد کرے لیکن اس کا حال یہ ہے کہ موانع پیش آنے کی صورت میں بجائے اس کے کہ وہ ان امانتوں سے کام لے کر انھیں دور کرے اور اپنے آقا کا حکم بجا لائے، کرتا یہ ہے کہ موانع کی شکایت کرکے اس حکم ہی سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے لیتا ہے اور ان امانتوں کو غاصبانہ طور پر اپنی خواہشوں کی چاکری میں لگا لیتا ہے۔

قانون اضطرار کی غلط تطبیق یہ عذر تو ان احکام کے متعلق تھا جن پر کار فرما اقتدار باطل کے باعث عمل ہو ہی نہیں سکتا، رہ گئے بعض وہ احکام جن پر عمل کرنے سے یہ اقتدار کفر بھی مانع نہیں ہے لیکن جو عمل بالقرآن کے دعویٰ کے باوجود بالکلیہ متروک ہیں مثلاً تحاکم الی الطاغوت اور حکم بامر الطاغوت سے اجتناب وغیرہ، تو ان کا ترک کر دینا بھی اس وجہ سے کامل عمل بالقرآن میں خارج نہیں تصور کیا جاتا کہ ایسا "اضطرار" کیا جاتا ہے اور اضطرار کی حالت میں ارتکاب حرام گناہ نہیں۔ لیکن ایسا یا تو اپنی اجتماعی ذہنیت کے غلط مطالعہ کی بنا پر کہا جاسکتا ہے یا پھر رخصت اضطرار کی لازمی حدود و قیود سے انتہائی ناواقفیت کی بنا پر۔ قانون اضطرار کے الفاظ یہ ہیں:۔

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (بقرہ ۲۱)

البتہ جو شخص مجبور ہو جائے (اور بحالت مجبوری حرام کھا کر اپنی جان بچا لے) بشرطیکہ اس حرام شے کے کھانے کی رغبت نہ رکھتا ہو اور نہ اس مقدار سے زیادہ کھانا چاہتا ہو جتنی کی زندگی بچانے کے لیے ضرورت ہے، تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ (اللہ اس کو معاف کر دے گا کیونکہ) وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

ان الفاظ سے جہاں بحالت مجبوری ایک ممنوع فعل کے ارتکاب کی رخصت معلوم ہوتی ہے، وہیں اس رخصت کے لیے تین شرطوں کی قید بھی ثابت ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ مجبوری واقعی ہو اور طلب و جستجوئے حلال کی تمام تدبیریں اس حد تک بیکار ہو چکی ہوں کہ بس لقمہ حرام کے سوا اب جان بچانے کا اور کوئی ممکن ذریعہ رہ نہ گیا ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ یہ استعمال حرام "غَيْرَ بَاغٍ" ہو یعنی دل میں اس کی کوئی رغبت نہ ہو بلکہ جو ارتکاب حرام کیا جائے پورے احساس ناگواری اور شدید جذبۂ نفرت و کراہت کے ساتھ کیا جائے۔ تیسری شرط یہ ہے کہ یہ ارتکاب حرام بھی بس اسی حد تک کیا جائے جس حد تک جان بچانے کے لیے ناگزیر ہو۔ اگر ان تین شرطوں کے ساتھ کوئی شخص ایک فعل حرام کا مرتکب ہو جائے تو اللہ تعالٰی اس کو قابل معافی قرار دیتا ہے، لیکن اگر ان تینوں شرطوں میں سے ایک شرط بھی تشنۂ تکمیل رہ گئی تو پھر یہ وعدۂ عفو و درگذر بھی شرمندۂ ایفا نہ ہوگا۔ شریعت اس وقت اپنی یہ رخصت واپس لے لے گی اور ایسا کرنے والا اس کی نگاہ میں نافرمان اور قابل مواخذہ قرار پائے گا۔

قانون اضطرار کی اس توضیح کی روشنی میں اپنے اجتماعی طرز عمل کا ٹھیک ٹھیک جائزہ لیجیے، اور پھر اپنی ملت کے ان خدا پرستوں کی تعداد بتائیے جو خداوندان باطل کے عرش فرمانروائی کے زیر سایہ رہنے، مسرفین کی اطاعت کرنے طاغوت کا حق غلامی تسلیم کرنے، اسمبلیوں میں جا کر قانون ساز اور شارع دین بننے، طاغوتی عدالتوں میں اپنے معاملات

لے جانے یا طاغوتی قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے میں وہی مجبوری، وہی احساس ناگواری اور وہی جذبۂ کراہت محسوس کرتے ہوں جو ایک مومن کو سور کی بوٹی حلق سے نیچے اتارنے میں محسوس ہو سکتی ہے۔ آخر کروڑوں انسانوں کا یہ انبوہ گراں غیر اللہ کی حاکمیت اور مسرفین کی اطاعت کو حقیقتاً اسی اضطرار کے ساتھ برداشت کر رہا ہے جس کا قرآن میں ذکر ہے؟ کیا مسلمانوں کے یہ غول در غول جو صبح سے شام تک طاغوتی عدالتوں کا طواف کیا کرتے ہیں، یہ سب واقعۃً اپنے اس فعل کو حرام ہی سمجھتے ہیں اور اس کو محض انتہائی مجبوری کے وقت ہی اختیار کرتے ہیں اور ان میں اپنی اغراض نفس کی پیروی، حدود اللہ سے بے اعتنائی اور احکام شریعت سے سرتابی کا کوئی داعیہ پنہاں نہیں ہوتا؟ اور وہاں صرف اس لیے جاتے ہیں کہ ان کی جان و مال کی حفاظت کا کوئی امکانی راستہ باوجود جستجو کے نہیں ملتا؟ اور پھر یہ جج اور مجسٹریٹ صاحبان جو اپنی زندگیاں آئین طاغوت کے مطابق "داد انصاف" دینے میں گزار دیتے ہیں۔ درحقیقت مخمصہ کے شکار اور کسی مجبوری کے مارے ہوئے ہیں؟ اور جس وقت وہ اللہ جل مجدہٗ کے قوانین پسِ پشت ڈال کر شیاطین انس کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق معاملات کا فیصلہ کرتے ہیں تو کیا ان کا دل اس فعل کی حرمت کا مقر اور اپنی اس فاسقانہ روش پر متنفر ہوتا ہے اور وہ بالکل غیر باغٍ وَّلَا عَادٍ ہو کر، بادل ناخواستہ اور بصد استکراہ، اس ظلم و فسق کے اسٹیج پر بیٹھتے ہیں جس کو کرسی عدالت کہا جاتا ہے اور جہنم کے ان دہکتے ہوئے انگاروں کو ہاتھ میں لیتے ہیں جن کو روپے کے نام سے اس کارگزاری کے عوض انھیں دیا جاتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو یقیناً یہ سب لوگ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ کی رخصت اور آمرزش کے مستحق ہیں اور ملت کو ترک کتاب الٰہی کا ملزم گردانناسراپا ظلم و بہتان ہے۔ کاش ایسا ہی ہوتا، مگر حقایق کا کیا کیا جائے کہ وہ ہماری اس خواہش سے ایک فی صدی بھی موافقت نہیں کرتے۔ اک ذرا انصاف سے کام لے کر واقعات پر نگاہ ڈالیے، تو مشاہدہ آپ کو اس حقیقت کے ماننے پر مجبور کر دے گا کہ اب تو ان عدالتوں میں جاتے وقت یا ان کی کرسیوں پر بیٹھتے وقت شرط اضطرار کی ضرورت کا تصور تک نہیں پیدا ہوتا، ان کرسیوں تک وہ مسلمان پہنچتا ہی کب ہے جو معاشی خستہ حالیوں کے باعث جسم و جان کا رشتہ نہ برقرار رکھ سکتا ہو اور اب اس کے سوا اس کے لیے اور کوئی چارہ کار ہی نہ رہ گیا ہو کہ بقائے حیات کے لیے یہ رزق خبیث قبول کرے۔ ان جگہوں تک تو وہی پہنچ پاتے ہیں جو پہلے ہی سے آسودہ حال ہوں یا کم از کم یہ کہ اس مہلک افلاس میں مبتلا نہ ہوں جس کو مخمصہ کہا جا سکے۔ اس لیے از روئے واقعہ یہ سب کچھ نہایت ٹھنڈے دل سے اور بالکل جائز سمجھ کر کیا جا رہا ہے۔ اولاد کو تعلیم دے کر تیار ہی اسی لیے کیا جاتا ہے کہ ان کرسیوں تک پہنچ سکیں اور جو پہنچ جاتا ہے وہ ترقی درجات کی کوششوں میں مصروف رہتا ہے۔ حالانکہ اگر واقعی اضطراری حالت کی وجہ سے اس نے یہ ذریعہ معاش اختیار کیا ہوتا تو اس کے ایمان کا طبعی اقتضاء یہ تھا کہ اس میں ترقی کرنے کی جدوجہد کرنے یا اس پر مطمئن ہونے کے بجائے اسے چھوڑ دینے اور کوئی جائز وسیلۂ رزق اختیار کرنے کے لیے بے چین رہتا مگر ایسے لوگ چراغ لے کر ڈھونڈھنے سے بھی شاید نہ مل سکیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کھلی ہوئی طاغوت نوازی کو اضطرار کا نام کس طرح دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر فی الحقیقت ہم غیر اللہ کی حاکمیت کو حرام سمجھتے اور ہماری غیرت ایمانی اس سے متنفر ہوتی تو یوں گھروں کے عیش اور مدرسوں کی قیل و قال اور حجروں کی ہائے وہو میں

سکون قلب کے ساتھ مشغول نہ رہتے۔ اگر ہم سے کچھ نہ بن پڑتا تو کم سے کم یہ تو ہونا چاہیے تھا کہ اس منکرِ اعظم کے ساتھ کسی قسم کا تعاون یا مداہنت کرنے کے بجائے اس کے خلاف زبان اور دل سے انتہائی نفرت کا اظہار کرتے۔ کہ بقول رسولؐ یہ ایمان کی آخری حد ہے مگر یہاں حال یہ ہے کہ نہ صرف اس سے کسی نفرت اور کراہت کی ضرورت نہیں محسوس کی جا رہی ہے بلکہ اس کو برا ہی نہیں سمجھا جاتا اور اس کے قیام کے لیے حلف وفاداری اٹھائی جاتی ہے اور اس کی بقا کیلئے جسم و دماغ کی ساری قوتیں نثار کی جا رہی ہیں۔ کیا ایک مبغوض شئے سے یہی برتاؤ کیا جاسکتا ہے؟ آخر اتنی بڑی عظیم الشان برائی کے ساتھ ایمان کے اس کم سے کم مقتضا کا تو اظہار ہونا چاہیے جس کی حدیث بالا میں وضاحت کی گئی ہے؟ یا اس سے بھی کم ایمان کا کوئی اور درجہ ہے؟ اضطرار کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے ورنہ اگر اس کے دامن میں اتنی وسعت ہے جتنی آپ نے سمجھ رکھی ہے تو یقین رکھنا چاہیے کہ دنیا کی کوئی برائی اور قرآن کی کوئی قانون شکنی بھی اس کے دائرہ سے باہر نہیں رہ سکتی اور ایک متبع قرآن اپنے نفس کی پیروی بالکل اسی بے باکی سے کرسکتا ہے جس بے باکی سے ایک منکرِ آخرت کرتا ہے اور اخلاق و خدا پرستی کے وہ سارے اصول و ضوابط بیکار ہو کر رہ جائیں گے جن کی تعلیم و تبیین کے لیے قرآن کا نزول اور صاحب قرآن صلعم کی بعثت ہوئی ہے۔ لیکن یاد رہے اضطرار کی یہ وہ تاویل ہے جس سے اللہ اور رسول بالکل بری ہیں۔

اصل یہ ہے کہ جب ایک برائی کسی سوسائٹی میں نمودار ہوتی ہے تو ابتدا میں سوسائٹی کا اجتماعی ضمیر اس پر نفرت اور ملامت کا اظہار کرتا ہے، اگر یہ جذبۂ نفرت و ملامت قوی ہو تو وہ برائی دب جاتی ہے، اور اگر یہ جذبہ اتنا کمزور ہو کہ اس برائی کو برگ و بار لانے سے نہ روک سکے تو اس کے جراثیم تیزی سے پھیلنے لگتے ہیں، اب اگر اس سوسائٹی کے خواص اپنے امکان بھر اس برائی کا استیصال نہ کریں بلکہ اس کے خلاف صرف اظہار خیال کر دینے ہی کو کافی سمجھیں تو رفتہ رفتہ ان کی نگاہیں بھی اس سے مانوس ہوتی چلی جاتی ہیں، اور زیادہ دن نہیں گذرنے پاتے کہ وہ برائی برائی نہیں رہ جاتی اور خاص و عام سب اسی رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں، اس وقت وہ معاشرہ کا جزو لاینفک بن جاتی ہے اور اس پر استحسان یا کم از کم اباحت کا ٹھپہ لگا دیا جاتا ہے اور اس کے لیے اپنے مسلّمہ اصول اخلاق میں تنسیخ اور تغیر تک گوارا کرلی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو جہاں اس بات کی ہدایت کردی گئی تھی کہ نیکی کو پھیلاتے اور برائی کو مٹاتے رہنا، وہیں اس خطرہ سے بھی آگاہ کردیا گیا تھا کہ اگر تم نے منکرات اور فواحش کی روک تھام نہ کی تو تمہارے دلوں تک وہ اپنے جراثیم پہنچا دیں گے اور تم خدا کی عنایات سے محروم اور اس کی لعنتوں کے مستحق ہو کر رہ جاؤ گے۔ لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں نے اس زریں ہدایت کو اپنے دماغوں میں محفوظ نہ رکھا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ان کے دل، ان کے دماغ، ان کے نقطہ ہائے نظر اور ان کے انداز فکر بدل کر کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں اور جس چیز سے نفرت ہونی چاہیے تھی اس سے رغبت کی جا رہی ہے، جس چیز سے بھاگنا چاہیے تھا اس کی طلب میں دوڑ لگائی جا رہی ہے، جس چیز کو پیروں تلے روند ڈالنا چاہیے تھا وہ دانتوں سے پکڑی جا رہی ہے۔ ان کے پیغمبر نے یہ بتلا دیا تھا کہ ایمان کی آخری حد یہ ہے کہ ہر برائی سے دل میں نفرت رکھی جائے، ایسی نفرت جو اس برائی کو مٹا دینے کے لیے اکسائی رہے۔ ورنہ اس سے نیچے ایمان کا کوئی درجہ نہیں یعنی کسی برائی کو نہ صرف برضا و رغبت قبول کرنے ہی کو منافی ایمان قرار دیا ہے بلکہ اس کو دیکھ کر اپنے اندر جذبۂ نفرت کا نہ محسوس کرنا بھی ویرانی قلب اور محرومی ایمان کی یقینی علامت بتایا ہے۔ مگر اب

اس تعلیم کے علمبرداروں کو اس امر پر بڑا اصرار ہے کہ ہم بلا اظہار کراہت اور بغیر کسی احساس نفرت کے غیر اللہ کی غلامی کا جوا اپنی گردنوں پر رکھیں گے، خود قانون ساز اور شارع دین بنیں گے، طاغوت کو اپنا حکم بنائیں گے طاغوتی قوانین کے مطابق معاملات کا فیصلہ کریں گے اور پھر بھی ہمارا دین جائے گا، نہ ایمان خراب ہوگا، نہ ہماری توحید اور عبودیت میں فرق آئے گا، نہ اتباع قرآن میں فتور واقع ہوگا، نہ ہم پر کتاب الٰہی کے ترک و نسیان کا الزام وارد ہوگا، نہ ہم نقض میثاق کے مجرم ہوں گے، کیونکہ ہم حالتِ "اضطرار" میں ہیں۔ ع وائے گرپس امروز بود فردائے۔

اس خیال خام اور فریب نفس کے مفاسد کا پورا پورا اندازہ آپ کو اس وقت ہو سکتا ہے جب آپ ان مذکورہ بالا احکام قرآنی کے چھوڑ بیٹھنے کے ان دور رس نتائج کو سامنے رکھ لیں جو ہمارے انفرادی اور اجتماعی مسائل زندگی کے اندر رونما ہوتے ہیں۔ غیر اللہ کی حاکمیت میں ایک وفادار رعایا بن کر رہنے کے معنی یہی نہیں ہیں کہ ہم نے ایک صریح حکم قرآنی کی خلاف ورزی کی بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اب ہماری زندگی شعوری یا غیر شعوری طور پر ایسے سانچے میں ڈھلتی چلی جائے گی جو اسلام کے مطلوبہ قالب سے بالکل مختلف ہوگا، اب ہمارے معاشرہ کی تاسیس ہمارے تمدن کی اٹھان، ہمارے نظام تعلیم کی تعمیر اور ہمارے مسائل معاش و اقتصاد کی تنظیم ایسی بنیادوں پر ہوگی، جو ہماری خواہشوں کے علی الرغم، ہم کو اپنے اجتماعی مسلک اور اپنے تصورات زندگی سے دور پھینکتی چلی جائیں گی، غیر الٰہی قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے اور کرانے کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ بس ایک گناہ سرزد ہو رہا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان بہت سے احکام اسلامی کو لپیٹ کر رکھ دیا جائے اور ان کی وقعت دلوں سے محو ہو جائے جو ہمارے معاملات زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور ہم اپنے دین اور قرآن کو سمیٹ کر مسجدوں اور حجروں میں بند کر دیں اور دین کے صرف اتنے حصہ پر اکتفا کر لیں جس کا تعلق چند مخصوص مذہبی رسوم و شعائر اور عبادات سے ہے۔ چنانچہ اب یہ سارے نتائج قیاس کے دائرے سے نکل کر واقعات کے عالم میں آچکے ہیں۔ اس ملت کے علمبرداروں نے قرآن کے ایک بڑے حصہ کو حکومت اور اولوالامر کے نام پر ترک کر کے اور عدم استطاعت اور اضطرار کے بہانے پیدا کر کے جن کا رہائے تاکردنی کو اختیار کیا ان کا نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کے بے شمار احکام اور اصول زندگی سے ان کا رشتہ کٹ گیا اور دین کے صرف ایک محدود حصہ پر وہ عمل کر سکنے کے قابل رہ گئے۔ ابتدا میں دین کے ان بنیادی اصولوں اور اس کے مقتضیات سے اس جبری علیحدگی پر خود ہی ایمان مضطرب ہوئی مگر امتداد زمانہ نے اس اضطراب کو سکون و اطمینان سے بدل دیا، اور اب انجام کار دماغوں پر غیر شعوری طور سے یہ وہم مستولی ہو گیا ہے کہ دین انہی چند عبادات کا نام ہے جن کو ہم ادا کر رہے ہیں اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے اس کا تعلق دنیا اور دنیاداری سے ہے۔ اس لیے اس قسم کے احکام و اصول قرآنی کے متروک ہو جانے کے باوجود ہمارا تدین غیر مشکوک اور ہمارا اتباع قرآن کامل ہے۔ دراصل یہی تصور دین ہے جس نے ان احکام متروکہ کی اہمیت ہماری نگاہوں میں گھٹا دی ہے اور اس حد تک گھٹا دی ہے کہ دلوں میں ان کے لیے کوئی اضطراب، کوئی تمنا اور کوئی حسرت باقی نہیں رہنے دی۔ مسجد کی ایک اینٹ بھی اگر کھود کر پھینک دی جائے تو اس گئی گذری حالت میں بھی مسلمانوں کی گردنیں خون کے دریا بہانے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں مگر اللہ کی بے شمار حدود کی بے حرمتی کو دیکھ کر تڑپنے کے سبیلے

ایک دل اور بہنے کے لیے ایک قطرۂ اشک بھی تیار نہیں۔ اس فرق کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ دین کا کام سمجھا جاتا ہے اور یہ دنیا کا۔ لیکن چونکہ اِن حدود و احکام کا ذکر بھی اسی قرآن میں موجود ہے جس میں اُن چند مخصوص عبادات کا، اور ہر اس حکم کے اتباع کا عہد کیا گیا ہے جو قرآن میں ہے، اس لیے زبان سے یہ کہنے کی جرأت تو نہیں ہوتی کہ یہ حدود و احکام دین سے خارج ہیں لیکن جب اطاعت امر اور ادائگی فرض کا سوال پیدا ہوتا ہے تو غیر شعوری طور پر دین کا وہی محدود تصور اور سہل پسندی کا مخفی جذبہ کبھی قانون اضطرار کی آڑ لینے پر مجبور کرتا ہے اور کبھی احکام کی ذمہ داری سے فرار کی سعی کی جاتی ہے۔

غرض غیرت ایمانی کی کمی، احساس فرض کی پژمردگی اور سہل پسندی و دنیا پرستی نے کافرانہ اقتدار اور کافرانہ اصول و نظریات کے سامنے سپر ڈال دینے پر آمادہ کیا، اس آمادگی نے قرآن کے ایک بڑے حصہ کو چھوڑنے پر مجبور کیا، اس مجبوری یا یوں کہیے کہ جبری ارتداد نے اپنی خدا پرستی اور بے گناہی کا بھرم رکھنے اور اپنی نگاہوں سے آپ اپنی خطاکار صورت چھپانے کے لیے دین کا تصور محدود اور بے روح کر دیا، ایسا محدود کہ جن احکام پر عمل نہیں ہو رہا ہے، ان کو دین ہی سے خارج کر دے اور ایسا بے روح کہ زندگی کے میدان وہ کہیں، ہماری اغراض کے برخلاف، مزاحم نہ ہو سکے۔ پھر اس محدود اور بے روح تصور دین نے ملت کی تمام فرض ناشناسیوں، کمزوریوں اور بے عملیوں کی شناعت کا احساس فراموش کرا دیا۔ سب سے آخر میں سیاسی اقتدار کے فقدان اور اضطرار کے حیلے آئے اور انھوں نے اس پورے سلسلۂ اوہام پر حقانیت کا پردہ ڈال دیا۔ اب یہ تمام خودساختہ اور فاسد نظریات ایک دوسرے سے غذا حاصل کر رہے ہیں اور سب نے مل کر مغالطوں کا ایسا جال تیار کر دیا ہے جس کے گھیرے میں عقلیں چکرا رہی ہیں، اور ان کے سامنے راہ حقیقت اس طرح مسدود ہے کہ اب ان میں تلاش منزل کے محرکات بھی دم توڑ رہے ہیں۔ اگر انسان میں اپنی غلطی کا احساس زندہ ہو تو امید کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن اس کی اصلاح کرے گا لیکن اگر یہ احساس مردہ ہو گیا اور اس کی نظر میں غلطی غلطی نہ رہ گئی تو پھر اس کے تائب ہونے کی تمام توقعات سراب ثابت ہوتی ہیں۔ اس لیے اگر اس ملت نے اپنی کامل تباہی اور دین و دنیا دونوں کی رسوائی کا تہیہ نہ کر لیا ہو تو اپنی بے گناہی کے زعم باطل سے اس کو جلد از جلد باز آ جانا اور اپنا جرم تسلیم کر لینا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کا قانون ہدایت بھی عجیب شان بے نیازی رکھتا ہے۔ ایک ہی چیز ہوتی ہے جس سے کسی کے سامنے ہدایت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور وہ حقیقت کو پا لیتا ہے، مگر وہی چیز دوسروں کو ضلالت کے فتنہ میں مبتلا کر دیتی ہے اور وہ راہ راست سے اور دور ہو جاتے ہیں۔ اس قانون کا راز اللہ جل مجدہٗ کی اس سنت عدل میں ہے کہ جو حق کی سچی طلب رکھتا ہے اسی کے سامنے راہ حق باز کی جاتی ہے اور جو حق سے بے اعتنائی برتتا ہے، اس کے سامنے حق کی تجلی کبھی نہیں چمکتی۔ آفتاب کی شعاعیں ایک عالم کو منور کر دیتی ہیں مگر چشم بوم اپنی کور نگاہی کی بنا پر اس کے فیضان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتی یہی حال آفتاب ہدایت کی شعاعوں کا بھی ہے۔ قرآن نے اپنی صفت جہاں یہ بتائی ہے کہ میں لوگوں کے لیے مشعل ہدایت ہوں، وہیں یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ بہتوں کے لیے وسیلۂ غوایت بھی ہوں۔ اس کے اس قول میں اسی قانون ہدایت کی طرف اشارہ ہے جس کے متعلق ہم یہاں گفتگو کر رہے ہیں۔ وہ اسی شخص کو راہ راست دکھاتا ہے جو دیکھنا چاہے اور اسی وقت دکھاتا ہے جب دیکھنے کی حقیقی آرزو ہو۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس کا یہ قانون صرف کفار کے لیے ہے اور مومن

چونکہ اس پر ایمان لا چکے ہیں، اس لیے اب وہ اس قانون سے آزاد ہیں۔ نہیں، یہ کافر اور مومن سب کے لیے عام ہے۔ ایک مومن بھی قرآن پر ایمان رکھنے کے باوجود در اصل زندگی میں اس قرآن سے اسی وقت کسب ہدایت کر سکتا ہے جب وہ پورے اخلاص قلب کے ساتھ اس کی طلب بھی کرے۔ ورنہ جس وقت بھی، اور زندگی کے جس معاملہ میں بھی، اس نے اس سے رہنمائی کی خواہش نہ کی اور غیر مشروط طور پر اس کی اقتدا کرنے اور اس غرض سے اس کا زاویۂ نگاہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کی، وہاں یقیناً وہ اس کو گمراہی کی تاریکیوں میں بھٹکتا چھوڑ دے گا، اور اس امر کا کوئی لحاظ نہ کرے گا کہ وہ میرا منکر نہیں بلکہ ماننے والا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مومن کو اس امر کی تلقین کی گئی ہے کہ ایمان لانے اور ہدایت یاب ہونے کے بعد بھی اپنے قلب و نظر کو کجروی سے مامون نہ سمجھے اور ہر وقت اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہے کہ خدایا میرے سامنے سے ہدایت کی روشنی گل نہ ہونے پائے۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا۔

قرآن کے ان احکام و فرامین کے بارے میں جو اس وقت زیر بحث ہیں، بالکل اسی مجرمانہ بے اعتنائی سے کام لیا جا رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں سے سمت منزل کی رہنمائی ہو رہی تھی، ٹھیک اسی جگہ سے بھٹکنے کا سامان فراہم کر لیا گیا۔ قرآن میں جو یہ الفاظ آتے ہیں کہ اے مومنو! ایک خدا کی فرمانروائی کے آگے خود جھکو اور سارے عالم کو جھکا دو۔ اے ایمان لانے والو! کفر کے علمبرداروں سے لڑ کر فتنہ کا سر کچل دو، اے ایمان رکھنے والو! معروف کا حکم دو اور منکر سے روک دو، اے مسلمانو! چور کا ہاتھ کاٹ دو اور زانی کو درے لگاؤ، وغیرہ ذالک، تو اس انداز خطاب کی اصل بنیاد ایک ایسی عظیم الشان حقیقت پر تھی کہ اس کا صحیح تصور ہی اس کار گہ حیات میں مومن کا مقام متعین کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اگر ہم طلب حق لے کر قرآن پر نگاہ ڈالتے تو پاتے کہ یہ طرز خطاب اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں اس امت کی حیثیت ایک حکمراں پارٹی کی ہے اور اس کا مقام رہبانیت کے حجروں میں یا محکومی کے جوتے تلے نہیں ہے بلکہ امامت و جہانبانی کے تخت پر ہے اور اس مسند امامت سے نیچے وہ اس کی حیثیت کو فرض ہی نہیں کرتا، نہ اس سے کم پوزیشن میں کبھی اس کو دیکھنا چاہتا ہے۔ سوچیے تو سہی زندگی کا کتنا بلند، حریت آموز اور جاں بخش تصور تھا جو اس اسلوب بیان میں موجود اور قلب مسلم کو کیسے پاکیزہ اور عالی عزائم سے معمور کر دینے والا سبق تھا جو اس اشارۂ قرآنی میں چھپا فکر و نظر کا منتظر ہے۔ مگر قصور نظر کا برا ہو زندگی کا پیغام بھی ہمارے لیے موت کا پروانہ بن گیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اللہ رب العزۃ کے اس طرز خطاب کے راز کو سمجھ کر اپنا کھویا ہوا مقام اور بھولا ہوا فریضہ یاد کیا جاتا اور اپنی کوتاہیوں پر نادم ہو کر ان کی تلافی کی سعی کی جاتی اور پھر اس مقام کی بازیافت کی سرفروشانہ جد و جہد کی جاتی جہاں ہمارا شہنشاہ مطلق ہم کو دیکھنا چاہتا ہے۔ مگر ہوا یہ کہ یہی انداز خطاب ہمارے لیے بے عملی کے جواز کی سند اور اقامت حق کی راہ کا روڑا بن گیا۔ اور یہ کہہ کر کہ چونکہ ان احکام کے مخاطب حکام خلافت ہیں اور اس وقت ہم کو "خلافت" کا اقتدار حاصل نہیں، ہم نے اپنی ذمہ داری کا بوجھ اتار کر پھینک دیا۔ یہ طرز فکر و عمل بالکل ایسا ہی ہے کہ ایک مسلمان جب قرآن و سنت پر نظر ڈالے اور دیکھے کہ مسلمان کی تعریف اور اسلام کا معیار یہ ہے کہ وہ متقی اور صالح ہو، متواضع اور مجاہد ہو، تمام اخلاق حسنہ سے متصف اور خصائل بد سے مجتنب ہو، حدود اللہ کا پابند اور تمام حقوق کا پورا کرنے والا ہو، یہ دیکھ کر وہ اس معیار تک پہنچنے کی اس بنا پر کوشش نہ کرے کہ میں ضعیف الایمان بھلا اس مقام تک کب پہنچ سکتا ہوں، ایمان کا یہ معیار تو بلند

تو بس صحابہ ہی کے لیے مخصوص تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ طرز فکر کتنا غلط ہے۔ اگر کوئی مسلمان قرآنی معیار ایمان سے فروتر ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس معیار تک پہنچنے کی ہر ممکن سعی کرے نہ کہ مشکلات کی فہرست سنا کر مطمئن ہو رہے۔

بالکل یہی روش آیت اضطرار کے بارے میں بھی اختیار کی گئی۔ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ کی شرط لازم میں غیرت حق کے تحفظ کا جو راز پنہاں تھا اور زندگی کے نازک سے نازک اور ناموافق سے ناموافق مواقع میں بھی اپنے مقام کی عظمت برقرار رکھنے اور اپنے مطمح نظر کا پاس رکھنے کا جو اصول پوشیدہ تھا اس کی طرف تو نظر نہیں گئی یا پہنچی ہوئی نظر کو بند کر لیا گیا لیکن فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ کی آڑ لے کر اباحت کا دروازہ کھول لیا گیا۔ بلاشبہ اس آیت میں بحالت مجبوری ایک فعل حرام کے ارتکاب کی گنجائش عطا کی گئی ہے لیکن یہ اس آیت کا صرف ایک پہلو ہے اور اس کا دوسرا پہلو، جو اپنی اہمیت کے لحاظ سے پہلے کی بہ نسبت کہیں زیادہ لائق اعتنا ہے، نظروں سے بالکل اوجھل ہے جس کا مدعا یہ ہے کہ تم کبھی، کسی حال میں بھی، کسی امر منکر پر قلب کی ادنیٰ سے ادنیٰ رضامندی کے ساتھ نہیں جم سکتے۔ بلکہ اگر کبھی ایسی صورت پیش آ جائے تو اپنے تمام افکار کو اسی ایک فکر میں تحلیل کر دینا کہ کسی طرح اس دام بلا سے نجات مل جائے جس میں سوءِ اتفاق نے لا پھنسایا ہے اور جب تک یہ نجات نہ مل سکے بس یوں سمجھنا کہ مردار کا سڑا ہوا گوشت ہے جس کو دانتوں سے نوچ رہا ہوں یا خنزیر کی بوٹیاں ہیں جن کو نگل رہا ہوں، یا عفونت بھری غلاظت ہے جس میں جسم اور کپڑے لت پت ہو گئے ہیں۔ اس احساس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تم اس حرام سے دور ہو جانے کی بالکل اس طرح بے تابانہ کوشش کرو گے جس طرح کسی آدمی کا پاؤں ننگے اور تپتے ہوئے سنگریزوں پر پڑ جاتا ہے تو وہ تلملا کر فوراً ہی اس کو اٹھا لینے اور کسی نرم اور ہموار زمین پر رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس آیت کا دیا ہوا یہ درس اگر ہم کو یاد ہوتا تو اس وقت ہماری دنیا یہ دنیا نہ ہوتی اور وہ شکست خوردہ ذہنیت، وہ پست نقطۂ نگاہ اور وہ ایمان سوز طرز فکر ہماری قوتوں کو اس طرح مفلوج نہ کر دیتا جسے ہماری ہوائے نفس نے کلام الٰہی کو بنیاد کار بنا کر ہمارے اندر پیدا کر دیا ہے۔ اور کروڑوں انسانوں کی اتنی بھاری جمعیت، اضطرار کے نام پر قرنوں تک منکرات اور خبائث کے ساتھ اس طرح کی قابل شرم سازگاری نہ دکھاتی کہ اتباع قرآن کا دعویٰ رکھنے کے باوجود اس کا قافلہ کفر و فسق کی بنائی ہوئی روش پر پورے ذوق و شوق کے ساتھ چلا جا رہا ہے، اور اس کے دل میں کبھی کوئی غیرت، کوئی نفرت اور کوئی بے چینی نہیں محسوس ہوتی۔ منکرات کے ساتھ سازگاری دکھانے کے بجائے ہم ان کے خلاف مجسم احتجاج ہوتے، ہمارا ذوق ایمانی ہماری زندگی کو تلخ بنا دیتا اور ہماری غیرت اسلامی ہم کو مجبور کر دیتی کہ اس غلاظت کفر کو، جس طرح بھی ہو سکے، اپنے دامن سے دھو کر دم لیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ہم کو اضطرار کی رخصت تو یاد رہ گئی مگر غیر باغ ولا عاد کی شرط اور اس شرط کے لوازم اور مقتضیات کو دانستہ یا نادانستہ بالکل نظرانداز کر دیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تریاق زہر کا کام دینے لگا۔

پس اس امت کے لیے ترک کتاب الٰہی کے جرم اور اس جرم کی رسوا کن سزاؤں سے نجات پانے کی اگر کوئی راہ ہے تو صرف یہ کہ وہ اپنی تمام تر کوششوں کو اس صورت حال کے بدل ڈالنے پر مرتکز کر دے جس میں وہ اپنے حاکم اعلیٰ کے فرامین سنتی ہے مگر عمل نہیں کرتی یا نہیں کر سکتی، دیر کہ اضطرار اور عدم استطاعت کا بہانہ کر کے اپنے جرم پر پردہ ڈال کر مطمئن ہو رہے۔ یہ اطمینان دراصل ایمان کے کھوکھلے ہونے یا دین کی بصیرت سے محروم ہونے کی دلیل ہے اور فریب نفس کا ایسا خطرناک طلسم ہے جو اگر پوری قوت سے نہ توڑا گیا تو قلب ملت کی وہ ضعیف ترین دھڑکنیں بھی ختم ہو جائیں گی جو ابھی تک کبھی کبھی محسوس ہو جاتی ہیں۔ (باقی)

رسائل و مسائل

علمبرداران حق کا قافلہ کی منزل میں

ذیل کے چند خطوط کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ تحریک اسلامی کو قبول کر لینے کی وجہ سے ہمارے رفقا کن کن مشکلات میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ بس جہاں کوئی سلیم الفطرت انسان خلوص و دیانت کے ساتھ خدا کا کام کرنے اٹھا، خدا کے بندے اس کے راستہ میں طرح طرح سے حائل ہونے لگے۔ طرفہ تماشا یہ کہ اس تصادم کا آغاز بالعموم گھر کی چار دیواری سے ہوتا ہے، ماں اور باپ، بہن اور بھائی ہی اعلان جنگ کرنے میں سبقت کرتے ہیں۔

مگر یہ سب کچھ توقع کے خلاف نہیں ہے، اس راہ میں ہمیشہ یہی پیش آیا ہے اور آج بھی یہی پیش آسکتا ہے۔ خوش بخت ہیں وہ لوگ جو غیر اللہ کے مظاہرۂ غیظ و غضب کا مقابلہ کرنے کے لیے خدا سے استقامت کی توفیق پائیں۔

سوال:- میں اپنے حالات مختصراً پیش کرتا ہوں۔ مجھے بتلایئے کہ کونسا طریق کار اختیار کروں کہ میرے اسلام میں فرق نہ آئے

(۱) والدین اٹھتے بیٹھتے اصرار کر رہے ہیں کہ ملازمت پر واپس چلا جاؤں۔ بحالت موجودہ وہ نہ صرف اپنا بلکہ خدا کا نافرمان بھی گردانتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ صرف ایسے وقت پر والدین کی نافرمانی جائز ہے جب وہ یہ کہیں کہ خدا کو نہ مانو۔ باقی تمام امور میں والدین کا حکم شرعی طور پر واجب التعمیل ہے۔ عنقریب وہ اعلان کرنے والے ہیں کہ نوکری پر چلا جاؤں تو بہتر ورنہ میرا ان سے کوئی تعلق نہ رہ سکے گا۔ بس وہ اتنی رعایت مجھے دیتے ہیں کہ اگر میں مستقل طور پر ملازمت اختیار کرنا نہیں چاہتا تو کم از کم سال ڈیڑھ سال اور اختیار کیے رکھوں، حتی کہ میرے چھوٹے بھائی بی۔ اے کر لیں اور میری خالی جگہ کو پر کر سکیں۔ اس سلسلہ میں گنہ وہ اپنے سر لیتے ہیں

(۲) ادھر عوام میں میری بے اثری بڑھ رہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس ذوق و شوق سے دوران ملازمت میں لوگ میری بات سنا کرتے تھے یا حمایت کا دم بھرا کرتے تھے اب وہ ختم ہو رہا ہے۔ بلکہ میری باتوں کا ان پر الٹا اثر ہوتا ہے۔

(۳) بڑے بھائی بتلاتے ہیں کہ اگر نوکری حرام ہے تو زمینداری کونسی حلال ہے۔ ہماری زمین سرکار ——(ایک ریاست) نے ہمارے آباء و اجداد کو بخشش کے طور پر دی تھی وہ تو تمہارے نظریہ کی رو سے حلال آمدنی قطعاً نہیں دے سکتی۔ علاوہ بریں اسلام میں زمیندارہ سسٹم سرے سے ناجائز ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہمارے دادا نے اپنی جائداد بروئے شریعت تقسیم نہیں کی تھی۔ ان کی وراثت صرف نرینہ اولاد میں چلی ہے اور مستورات کو محروم رکھا گیا ہے۔ پھر نوکری کو حرام کہنے کے بعد ایسی جائداد پر کوئی شخص کیسے بسر اوقات کر سکتا ہے؟

(۴) مسلمانوں کی اکثریت جہالت اور شرک میں مبتلا ہے۔ قبروں پر حاجات لے کر جانے اور نہ جانے کا سوال بہت اہمیت اختیار کیے ہوئے ہے۔ اس سلسلہ میں اگر مصلحۃً سکوت کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حق کو قبول کرنے کے ساتھ لوگ شرک کرنے کی گنجائش کو بھی بحال رکھیں یوں بھی مصلحت اندیشی تا کجے۔ آخر بھانڈا پھوٹتا ہے اور لوگوں کو معلوم ہو کے رہتا ہے کہ ہم قبروں پر جا کر حاجات طلب کرنے کے خلاف ہیں۔ جہاں یہ بات کھلی بس فوراً ہی آدمی کو وہابی کا سرٹیفکیٹ ملا اور کسی کو وہابی قرار دینے کے بعد لوگ اس کی بات سننے پر آمادہ ہی نہیں ہوتے بلکہ اس سے بدکنے لگتے ہیں کہ کہیں یہ بودیں عقائد کے اس محل پر پتھر نہ پھینک مارے جس کی تعمیر میں ان کے آباؤ اجداد نے پسینے بہائے ہیں اور جس کی حفاظت میں عمریں گذار دی گئی ہیں۔ میں بھی اب اسی خدشہ کا ہدف بن رہا ہوں۔

جواب:- آپ کا عنایت نامہ ملا۔ آپ اب اسی مرحلہ پر پہنچ گئے ہیں جس سے میں نے آپ کو یہاں پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ میں اس معاملہ میں آپ سے یہ نہیں کہوں گا کہ آپ کیا رویہ اختیار کریں۔ اس کا فیصلہ آپ کو بالکل اپنے قلب وضمیر کی آواز پر کرنا چاہیے اور اپنی ہمت کا جائزہ لے لینا چاہیے۔ بہرحال جو فیصلہ بھی آپ کریں۔ ٹھنڈے دل سے کریں اور خدا سے دعا مانگتے رہیں کہ آپ کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں جس کے بعد پسپائی کی نوبت آئے۔ پسپا ہونے سے اقدام نہ کرنا زیادہ بہتر ہے۔

فیصلہ کو آپکے اپنے ضمیر پر چھوڑنے کے بعد میں صرف ان دلائل کا جواب دیے دیتا ہوں جو آپکے مقابلہ میں پیش کیے جاتے ہیں:

(۱) عذاب و ثواب کوئی کسی کا دنیا میں نہیں اٹھا سکتا۔ ہر شخص اپنے عذاب و ثواب کا خود حامل ہے۔ میرے کہنے سے اگر آپ کوئی گناہ کریں تو میں کہنے کا گنہگار ہوں گا اور آپ کرنے کے گنہگار ہوں گے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپکے کرنے کا گناہ بھی کہنے والے کی طرف منتقل ہو جائے۔

(۲) والدین کی فرمانبرداری صرف اسی حد تک ہے جس حد تک ان کی فرمانبرداری سے خالق کی نافرمانی لازم نہ آتی ہو۔ اگر وہ کسی معصیت کا حکم دیں تو ان کی اطاعت کرنا صرف یہی نہیں کہ فرض نہیں ہے بلکہ الٹا گناہ ہے۔

(۳) جس فعل کو آپ خود معصیت سمجھتے ہوں اسے ڈیڑھ یا دو سال تک صرف اس لیے کرتے رہنا کہ خاندان کا ایک اور فرد آپ کے بجائے اس معصیت کے لیے تیار ہو جائے، بالکل ایک غلط فعل ہے۔ اگر آپ اپنے عقیدہ میں صادق ہیں تو آپ کی یہ دلی خواہش ہونی چاہیے کہ نہ صرف آپ خود اس سے بچیں بلکہ خدا کا ہر بندہ اس سے محفوظ رہے۔

(۴) یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام میں زمینداری سرے سے ناجائز ہے۔ زمین کی شخصی ملکیت کو اسلام تسلیم کرتا ہے اور اگر کوئی شخص خود کاشت نہ کر سکتا ہو تو بٹائی پر دوسرے کو دینا جائز ہے۔ البتہ ہندوستان میں زمینداری کی بعض شکلیں ایسی ضرور رائج ہو گئی ہیں جو جائز نہیں ہیں۔ اگر شرعی طریقہ پر آپ زمینداری کریں اور ناجائز فائدے اٹھانے سے بچیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

(۵) جو جائداد کسی شخص کو آباؤ اجداد سے ملی ہو اس کی سابق تاریخ دیکھنے کا شریعت نے اسے مکلف نہیں کیا۔ اس معاملہ میں قرآن کا قانون گذشتہ پر گرفت نہیں کرتا بلکہ حال اور مستقبل کی اصلاح ہی پر اکتفا کرتا ہے۔ اس کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ جب وہ جائداد اس کی ملکیت میں آئے اس وقت سے وہ اس میں شرعی طریقہ پر تصرف کرے اور سابق میں جن

لوگوں نے اس کو غلط طریقہ سے حاصل کیا تھا اور اس میں غلط تصرفات کیے تھے ان کے معاملہ کو خدا پر چھوڑ دے۔ البتہ اگر کوئی چیز آپ کے قبضہ میں ایسی ہو جس کے بارے میں آپ کو متعین طور پر معلوم ہو کہ اس میں فلاں فلاں لوگوں کے غصب شدہ حقوق شامل ہیں اور وہ لوگ بھی موجود ہوں، نیز ان کا حصہ بھی متعین طور پر معلوم ہو تو اپنی حد تک ان کے حقوق واپس کر دیجیے۔

(۶) ملازمت کے زمانہ میں آپ کے ذاتی اور خاندانی اثر کی بدولت جو لوگ آپ کا اثر قبول کر رہے تھے وہ حقیقت میں دین کی دعوت سے متاثر نہیں ہو رہے تھے، وہ جاہ و مال کے بت کی پوجا کر رہے تھے اور آئندہ بھی اگر آپ اس پوزیشن پر رہیں تو یہ دھوکا کھائیے گا کہ لوگوں کو آپ خدا پرست بنا رہے ہیں۔ سچے خدا پرست تو وہی لوگ ہوں گے جو آپ کی دنیوی پوزیشن کو دیکھ کر نہیں بلکہ آپ کی دعوت کی سچائی اور آپ کے تقویٰ کو دیکھ کر متاثر ہوں۔ میرے نزدیک تو آپ صحیح معنوں میں دعوتِ حق کے داعی اسی وقت بنیں گے جب تمام اعزازات آپ سے چھن جائیں، زمین آپ کو جگہ دینے سے انکار کر دے اور وہ سب جو کل تک آپ کے سامنے جھکے پڑتے تھے، آپ کو رد کرنے اور آپ سے منہ پھیرنے پر اتر آئیں۔ یہ صورت حال ہے تو بہت خطرناک لیکن اس راہ میں یہی کچھ مفید ہے۔ اگر خدا نے آپ کو اتنی طاقت دی کہ آپ اسے برداشت کرنے کے قابل ہو جائیں تو اس کا حقیقی فائدہ آپ کو آگے چل کر معلوم ہوگا اور اسی وقت آپ کو اللہ تعالیٰ جھوٹے رفیقوں کی رفاقت سے بچا کر سچے رفیق بہم پہنچائے گا۔

(۷) عوام کے عقائد پر خواہ مخواہ باول ہلہ ضرب لگانے سے پرہیز کرنا چاہیے لیکن اپنے عقائد پر پردہ ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ "وہابیت" کے الزام سے بچنے کا اہتمام نہ کیجیے۔ لوگوں نے درحقیقت مسلمان کے لیے یہ دوسرا نام تجویز کیا ہے۔ وہ گالی مسلمان کو دینا چاہتے ہیں لیکن مسلمان کہہ کر گالی دیں تو اپنا اسلام خطرہ میں پڑتا ہے اس لیے وہابی کہہ کر گالی دیتے ہیں۔ اس حقیقت کو جب آپ سمجھ جائیں گے تو پھر وہابی کے خطاب سے آپ کو کوئی رنج نہ ہوگا۔ جو عقائد اور جو اعمال مشرکانہ ہیں ان سے بہر حال پرہیز کیجیے اور توحید کو اس کے اصلی تقاضوں کے ساتھ بے تکلف بیان کیجیے۔ شرک اور مشرکانہ باتوں سے پرہیز اور توحید اور مقتضیاتِ توحید کی پابندی اگر وہابیت ہے تو خدا اپنے ہر بندے کو وہابی ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور غیر وہابی ہونے سے بچائے۔

سوال:۔ موبجاتی اجتماع سے واپس آنے پر میں یکایک ان پریشانیوں میں مبتلا ہو گیا ہوں جو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھیں۔ آپ کی شدید مصروفیات کا علم رکھنے کے باوجود ان احوال کا تفصیلی تذکرہ آپ ہی کے اس ارشاد کی بنا پر کر رہا ہوں کہ اس نوعیت کے امور سے آپ کو پوری طرح مطلع رکھنا ضروری ہے۔ خیر تو ۱۹ اکتوبر کو والد مکرم کا جو گرامی نامہ موصول ہوا ہے وہ لفظ بلفظ درج ذیل ہے:۔

"برخوردار نور چشم ——— بعد دعائے ترقیٔ درجات کے واضح ہو کہ اب تم خود مختار ہو گئے ہو، ہماری سرپرستی کی ضرورت نہیں، کیونکہ ہم مکان پر بیکار پڑے ہیں اور تم کو جلسوں کی شرکت لازم اور ضروری۔ اب اللہ کے فضل سے نوکر ہو گئے۔ ہم نے اپنی تمام کوشش سے تعلیم میں کامیاب کرایا اور اس کا نتیجہ پایا۔ عالم باعمل ہو گئے کہ باپ کا حکم ماننا ظلم اور حکم خدا کے خلاف قرار پایا۔ اوروں کا حکم ماں باپ سے

زیادہ افضل! خیر تمھاری کمائی سے ہم نے اپنی ضعیفی میں بڑا آرام پایا۔ آئندہ ایک پیسہ بھی ہم لینا نہیں چاہتے۔ جو تمھارا جی چاہے کرو اور جہاں چاہے رہو، خواہ سسرال میں یا کسی اور جگہ۔ البتہ ہم اپنی صورت اس وقت تک نہیں دکھلانا چاہتے جب تک جماعت سے استعفا نہ دیدو۔ تم نے برابر اس مزاق میں (یعنی تحریک اسلامی کی خدمت میں) سب تعلیم کا کام خراب کر دیا۔ مگر ہمارا نصیحت کرنا بیکار ہے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ ہمارے سامنے نہ آنا۔ ہمارا عذر بہت خراب ہے۔ فقط

والد مکرم کے اس خط کا جواب راقم الحروف نے یہ لکھ دیا:۔

" محترمی! کل آپ کا گرامی نامہ بدست .... موصول ہوا۔ اسے دیکھ کر اور آپ کی بیماری کا حال معلوم کر کے بڑا افسوس ہوا۔ یقین جانیے مجھے خبر تک نہ تھی کہ آپ بیمار ہیں۔ نہ آپ نے کوئی خط لکھا نہ مجھے کسی اور ذریعہ سے حال معلوم ہوا ورنہ میں یقیناً وہاں نہ جاتا۔ یہ ایک عذر شرعی تھا جس کی بنا پر سفر کو ملتوی کیا جا سکتا تھا۔

والدین کے احسانات اور ان کی مہربانیوں کا کون انکار کر سکتا ہے۔ پھر آپ نے تو اعلیٰ تعلیم و تربیت کی اور دینی علم سے آراستہ کیا۔ اسی تعلیم سے مجھے یہ یقین حاصل ہوا کہ دین کو دنیا میں غالب کرنا، خدا کے کلمہ کو بلند کرنا، دنیا میں اسلام کا سکہ چلانا اور اس کے لیے کوشش کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ میں نے گرد و پیش کی دنیا پر نظر ڈالی اور مجھے ایک ہی جماعت اس مقصد کے لیے صحیح طریقہ اور اصلی اور بہترین ڈھنگ سے کام کرتی ہوئی نظر آئی اور وہ جماعت "جماعت اسلامی" ہے۔ اس لیے اگر مجھے دین کو دنیا میں غالب کرنے کے لیے کوشش کرنی ہے تو اس سے منسلک رہنا ضروری ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ دین کے غلبہ کی کوشش اگر مسلمان کی زندگی کا مقصد نہیں تو پھر اور کیا مقصد ہے!

والدین کا حکم ماننا ضروری! ان کی اطاعت فرض! لیکن کہاں تک؟ جب تک خدا اور رسول کے حکم کے خلاف نہ ہو۔ اگر دین کو غالب کرنا ضروری ہے تو وہ کیا یونہی آرام سے بیٹھے ہوئے، بے انتھک کوشش کیے ہوئے ہو سکتا ہے؟ کیا یہ کوئی بہت سہل کام ہے؟ کیا دین کے لیے اتنی قوت اور اتنا وقت بھی صرف نہیں کرنا چاہیے جتنا ہم اپنے پیٹ کے لیے کرتے ہیں؟ کیا یہ کام تنہا ایک آدمی کے کرنے کا ہے؟ ـــ بہرحال دین کے لیے جس جماعت میں بھی رہ کر کام کیا جائے گا اس میں وقت بھی صرف ہوگا، مال بھی خرچ کرنا ہوگا، تکلیف بھی ہوگی، کچھ دنیاوی کاموں کا حرج بھی ہوگا، اور کسی نہ کسی قوت سے تصادم کا ڈر بھی ہوگا اور آپ منع فرمائیں گے۔ پھر مقصد! آپ ہی بتائیے کہ اس کام کی اور کیا صورت ہو سکتی ہے؟ آپ کی سرپرستی سے محروم ہو جانا میری انتہائی بدنصیبی ہے۔ لیکن یہ تو خیال فرمائیے کہ آپ کس چیز سے مجھے منع فرما رہے ہیں۔ ذرا خود تو دیکھیے کہیں یہ حکم خدا کے خلاف تو نہیں ہے

قل ان کان اٰباءکم وابناءکم واخوانکم وعشیرتکم واموال ن اقترفتموھا وتجارۃ تخشون کسادھا ومساکن ترضونھا احب الیکم من اللہ ورسولہ وجہاد فی سبیلہ فتربصوا حتی یاتی اللہ بامرہ۔ واللہ لا یھدی القوم الفاسقین (سورہ توبہ) ترجمہ:۔ اے نبی فرما دیجیے کہ اگر تمھارے باپ، تمھارے بیٹے، تمھارے بھائی، تمھاری بیویاں، تمھارے خاندان، تمھارے وہ اموال جو تم نے محنت سے کمائے ہیں اور تمھاری وہ سوداگری جس میں گھاٹا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو اور تمھاری مرغوب آرام گاہیں تمھیں اللہ، اس کے رسول اور اس کی راہ میں سر توڑ کوشش کرنے کے مقابلہ میں محبوب تر ہیں تو انتظار کرو اس گھڑی کا کہ اللہ کا فیصلہ صادر ہو جائے۔ اور یاد رکھو کہ اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں بخشتا۔

میں سخت حیرت اور انتہائی افسوس کے ساتھ دیکھ رہا ہوں کہ دین کے غلبہ کے لیے جو کوشش میں کر رہا ہوں اس پر آپ ناراض ہیں۔ آخر آپ ہی فرمایئے کہ اس صورت میں میرا فرض کیا ہے؟ مندرجہ بالا آیت کو ملحوظ رکھ کر سوچیے۔

حاضر ہونے کو جی چاہتا ہے مگر آپ کے عتاب سے خائف ہوں۔ دیکھیے آپ کیا اجازت عنایت فرماتے ہیں۔"

یہ جواب اس پس منظر کی بنا پر لکھا گیا تھا کہ والد صاحب وقت کی اضاعت، صرف مال اور خوف قوت تسلط کی بنا پر جماعت میں کام کرنے سے منع کرتے ہیں نیز دیگران کے اشارے پر ...... سے ایک بہت مدلل قسم کا طویل وعریض خط آیا تھا جس کا ماحصل یہ تھا کہ بہرحال حق واسلام جماعت اسلامی میں منحصر نہیں، تنہا کام کیجیے یا کسی اور جماعت میں رہ کر۔

والد محترم کی طرف سے مجھے ابھی تک منقولہ بالا عریضہ کا جواب نہیں ملا ہے۔ اندریں حالات مناسب ہدایات سے مستفید فرمایئے۔

جواب:۔ آپ نے والدین کے عتاب پر جو جواب دیا ہے وہ بہت معقول ہے۔ مسلمان کی زندگی ایک نہایت متوازن زندگی کا نام ہے جس میں تمام حقوق وفرائض کا مناسب لحاظ ہونا چاہیے اور کسی حق یا فرض کی اضاعت نہ ہونی چاہیے، الا یہ کہ ایک حق کو دوسرے حق پر اس حد تک قربان کیا جائے جس حد تک ایسا کرنا شرعاً ضروری ہو۔ والدین کا حق خدا کے حق کے بعد سب سے بڑا ہے، لیکن بہرحال خدا کے حقوق کے بعد ہی، اس پر مقدم کسی طرح نہیں ہے۔ پس جہاں خدا کا حق ادا کرنے کے لیے والدین کے حق میں کوئی کمی کرنا بالکل ناگزیر ہو وہاں موقع ومحل کو ٹھیک ٹھیک ملحوظ رکھتے ہوئے صرف اسی حد تک کمی کی جائے اور ساتھ ساتھ ان کے عتاب اور خشم کو نہایت تحمل اور تواضع کے ساتھ برداشت کیا جائے۔ ان کی سختی کے مقابلہ میں اف تک نہ کیجیے، مگر جس چیز کو آپ اپنی دینی بصیرت کے مطابق دین سمجھتے ہیں اس سے والدین کو خوش کرنے کے لیے بال برابر بھی نہ ہٹیے۔ اولاد پر والدین کی خدمت، اطاعت اور ادب فرض ہے لیکن ان کی خاطر ضمیر کی قربانی فرض نہیں ہے، خصوصاً اس ضمیر کی جو دین کی روشنی سے منور ہو چکا ہو۔

اس معاملہ میں آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسوہ حسنہ کی پیروی کرنی چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی متعدد صحابہ کرامؓ کو یہ مشکل پیش آچکی ہے۔ اس وقت حضورﷺ کی رہنمائی میں صحابہ کرام نے اپنے ان والدین کے ساتھ جو راہِ حق میں کسی نہ کسی طرح مزاحم ہو رہے تھے، جو طرز عمل اختیار کیا اس کو ملحوظ رکھیے۔

سوال:۔ ہمارے ہاں کے ایک نوجوان رکن جماعت ...... میں اپنے بڑے بھائی کی زیر سرپرستی تجارت کر رہے ہیں لیکن دین میں احکام شریعت کی پابندی اور وقت پر نماز پڑھنے کے لیے چلے جانے کی بنا پر ان کے بڑے بھائی سخت برہم ہیں اور ان پر سختی کر رہے ہیں۔ اب تک ان کے کئی خطوط میرے نام آچکے ہیں جن میں انھوں نے لکھا ہے کہ تیرے (یعنی راقم الحروف کی) وجہ سے میرا بھائی خراب ہو گیا ہے، اس پر دیوانگی طاری ہے۔ کاروبار میں اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی، رات دن تیرا وظیفہ پڑھتا ہے۔ تو شیطان ہے، انسان کی شکل میں ابلیس ہے، ماں باپ اور اولاد میں اور بھائیوں میں جدائی ڈالتا ہے، میرے بھائی سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھ، اس کے نام نہ خط لکھ نہ ہی اجتماع میں شرکت کی دعوت دے، بلکہ اس کو جماعت سے خارج کر دے ورنہ ———— !

اس سلسلہ میں مناسب ہدایات سے ہماری رہنمائی کیجیے۔"

جواب:۔ جہاں خاندان کے لوگ جاہلیت میں مبتلا ہوں اور راہ راست پر چلنے میں اپنے بھائی بندوں کی مزاحمت کرتے ہوں وہاں توقع الواقع جدائی ڈالنا ہی ہمارا کام ہے۔ ایسے اعزہ واقربا اور دوستوں سے اہل ایمان کو ملانا نہیں، بلکہ توڑنا اور کاٹنا ہی ہمارے پیش نظر ہے۔ لہذا جو الزام ہمارے رفیق کے بھائی نے آپ پر لگایا ہے، اس کی تردید کی ضرورت نہیں بلکہ صاف صاف اعتراف کی ضرورت ہے اور بہت نرمی کے ساتھ ان کو اس بات سے آگاہ کرنے کی ضرورت ہے کہ اگر وہ اس جدائی کو میل اور موافقت میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں تو خدا پرستی اور دینداری میں مزاحم ہونے کے بجائے مددگار اور ساتھی بننے کی کوشش کریں ورنہ ہم اور ہمارا رفیق اپنے طرزِ عمل پر قائم رہیں گے اور آپ کو اختیار ہے کہ جو سلوک آپ کا نفس ہمارے ساتھ کرنا چاہتا ہے وہ کر لیں۔

البتہ یہ خیال رکھیے کہ آپ کی طرف سے کوئی بات ضد یا اشتعال دلانے والی نہ ہو، بلکہ صبر و تحمل کے ساتھ اس شخص کے نفس کی اصلاح کرنے کی کوشش کیجیے جس کو جاہلیت کے غلبہ نے اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ وہ اس آیت کا مصداق بن گیا: ارأیت الذی ینھٰی عبداً اذا صلّٰی۔

درحقیقت یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے گروہ میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جن کو نماز کی پابندی تک گوارا نہیں ہے۔ خود پابندی کرنا تو درکنار، دوسرا اگر کرتا ہے تو اس پر بھی بگڑتے ہیں۔ ایسے مسلمانوں کی حالت پر اگر کبھی ہم تنقید کرتے ہیں تو ہمیں خارجیت کا طعنہ دیا جاتا ہے۔

سوال:۔ میں بغرض تعلیم اسی سال .... چلا گیا تھا۔ داڑھی رکھ کر گھر واپس آیا تو تمام دوست و احباب نے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ خود والد مکرم بھی بشدت مجبور کر رہے ہیں کہ "داڑھی صاف کرا دو کیونکہ اس کی وجہ سے تم بڑے بوڑھے معلوم ہوتے ہو۔ اگر اصرار سے کام لو گے تو ہم تم سے کوئی تعلق نہ رکھیں گے۔" گھر سے نکلنے پر دوست بہت تنگ کرتے ہیں اس لیے مجبوراً خانہ نشینی اختیار کر لی ہے۔ لیکن ستم تو یہ ہے کہ اب چند اصحاب کی طرف سے یہ پیغام ملا ہے کہ "اگر آٹھ یوم میں ہمارا مطالبہ پورا نہ کیا گیا یعنی ڈاڑھی نہ منڈوائی گئی تو تمام برادری سے متفقہ بائیکاٹ کرایا جائے گا۔ بڑی عمر میں یہ شوق رکھ لینا مگر اب اگر رکھو گے تو زبردستی سے کام لیا جائے گا۔" میں ڈاڑھی کو پابندی احکام شریعت جب بہت محدود پاتا ہوں۔ مثلاً مجھے سینما بینی کا شوق تھا مگر اب ڈاڑھی رکھنے کے بعد سینما ہال میں جانے سے شرم معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جب مخالفین کے دلائل سنتا ہوں تو کبھی کبھی یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید یہ لوگ ٹھیک کہتے ہیں مگر پھر یہ جذبہ کام کرنے لگ جاتا ہے کہ چاہے پوری دنیا میری مخالفت پر اتر آئے، میرے رویہ میں کوئی تبدیلی نہ ہو گی۔ لہٰذا میری رہنمائی کیجیے تاکہ مجھے اطمینان نصیب ہو۔

جواب:۔ جب آپ نے سنت رسول سمجھ کر یہ کام کیا ہے تو پھر کسی کے اعتراض و مخالفت کی پروا نہ کیجیے اور سب سے کہہ دیجیے کہ یہ داڑھی رہنے کے لیے آئی ہے، جانے کے لیے نہیں آئی، اس کے ہوتے ہوئے اگر آپ میرے ساتھ تعلقات رکھ سکتے ہیں تو رکھیے اور اگر آپ کے لیے سنت رسول اس قدر ناقابل برداشت ہے کہ اس کی وجہ سے میرے ساتھ بھی تعلق رکھنا ناگوار ہے تو بخوشی قطع تعلق کر لیجیے، میرے لیے خدا اور رسول کافی ہیں۔

اختلافی مسائل پر امت سازی کا فتنہ

سوال:۔ مجھے مذہبی تنازع اور تفرقے سے فطری بُعد ہے اور وہ تمام جزئی مسائل جن میں اختلاف کرنے کی گنجائش خود شریعت میں موجود ہے ان میں اختلاف کو جائز رکھتا ہوں۔ اسی طرح اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی معاملہ میں دو یا تین طریقے عمل ثابت ہوں تو ان سب کو جائز اور سنت کی حد کے اندر شمار کرتا ہوں۔ مثلاً نماز میں رفع یدین کرنا اور نہ کرنا میرے نزدیک دونوں برابر ہیں، چنانچہ میں ان دونوں صورتوں پر عمل کرتا ہوں۔ کبھی اس پر اور کبھی اس پر۔ مجھے اپنے اس مسلک پر پورا پورا اطمینان ہے اور میں نے اسے سوچ سمجھ کر اختیار کیا ہے۔ مگر والد محترم نے جو رکن جماعت بھی ہیں محض نماز میں رفع یدین کا التزام چھوڑ دینے کی وجہ سے مجھے یہ نوٹس دے دیا ہے کہ اگر تم نے اپنی روش نہ بدلی تو پھر ہمارے تمہارے درمیان سلام کلام کا تعلق برقرار نہیں رہ سکتا۔ میں نے انھیں مطمئن کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اب یہ قضیہ میرے اور والد محترم کے حلقہ تعارف میں بحث کا موضوع بن گیا ہے اور دونوں کی تائید اور تردید میں لوگ زورِ استدلال صرف کر رہے ہیں۔ مجھ پر جو بے سروپا اعتراضات عموماً ہو رہے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ تو حنفی ہو گیا ہے، تیرا دو طریقوں پر عمل کرنا دو عملی اور نفاق ہے، تم جماعت کی اکثریت سے مرعوب ہو گئے ہو، تمہارا اصل مقصود طلب زر اور حصولِ عزت ہے، تمھیں احناف نے یہ پٹی پڑھائی ہے، تو مودودی صاحب کا مقلد ہے، وغیرہ۔ ان اعتراضات میں سے دلچسپ ترین تو یہ تھا کہ ہمیں پہلے ہی مودودی صاحب سے یہ اندیشہ تھا کہ وہ جماعت اسلامی کے نام پر اہل حدیث کو حنفی بنا کے رہیں گے، چنانچہ یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔ یعنی پہلے پہل تو اس جماعت میں آنے والے سے کہا جاتا ہے کہ تمہارا فقہی مسلک جماعت میں آنے کے بعد بھی برقرار رہیگا، مگر جماعت میں آنے کے بعد ایسے طریقوں سے کام لیا جاتا ہے کہ کسی شخص کو خود کوئی احساس بھی نہیں ہوتا اور اس کا مسلک سراسر بدل جاتا ہے۔ میں حسب موقع ان سب اعتراضات کے جواب دیتا رہا ہوں، لیکن پھر بھی اپنے اطمینان کے لیے حسب ذیل امور کی وضاحت چاہتا ہوں:۔

۱۔ والدین کے حقوق کا دائرہ کتنا وسیع ہے؟ کیا وہ اولاد سے مسائل کی تحقیق کا اور اپنی تحقیق کے مطابق عمل کرنے کا حق بھی سلب کر سکتے ہیں؟ کیا والدین کی مرضی کے خلاف مسلک اہل حدیث کی خلاف ورزی (یعنی ترک رفع یدین) کرنے پر "سخط الرب فی سخط الوالدین" کی وعید کا مستوجب ہو جاؤں گا؟

۲۔ از روئے شریعت نماز میں رفع یدین کرنے یا نہ کرنے کا مسئلہ کیا حیثیت رکھتا ہے؟ کیا ترک رفع سے آدمی دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے؟

۳۔ کیا ایک رکن جماعت دوسرے رکن سے اس بنا پر مقاطعہ کر سکتا ہے کہ اس نے مزعومہ مسلک اہل حدیث کی خلاف ورزی کی ہے؟

جواب:۔ جس نزاع کا آپ نے ذکر کیا ہے، اس کا حال پڑھ کر مجھے بہت رنج ہوا۔ مجھ کو اس بات کی ہرگز توقع نہ تھی کہ ہماری جماعت میں اب بھی ایسے لوگ موجود ہوں گے جو فقہی مسائل میں تعصب و تشدد کی اس حد کو پہنچے ہوئے ہوں گے۔ اگر آپ جیسا معتمد علیہ آدمی ان حالات کا راوی نہ ہوتا اور ایک دوسری اطلاع سے آپ کی تائید نہ ہو گئی ہوتی تو شاید

میں اس بات کو باور کرنے کے لیے تیار نہ ہوتا کہ واقعی ہماری جماعت میں ایسی صورت حال پیدا ہوئی ہوگی۔ بہرحال اب کہ اس نزاع نے سر اٹھا ہی لیا ہے، میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ اس معاملہ کی اصولی اور فقہی اور جماعتی حیثیت کو صاف صاف واضح کر دوں۔

۱۔ اصولی حیثیت سے یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ شرعی مسائل میں کسی شخص یا گروہ کا کسی خاص طریق تحقیق و استنباط یا کسی مخصوص مذہب فقہی کی پیروی کرنا اور چیز ہے اور اس کا اپنے اس خاص طریقہ یا مذہب کے لیے متعصب ہونا اور اس کی بنا پر جتھے بندی کرنا اور اس سے مختلف مذہب رکھنے والوں سے مغایرت و منافرت برتنا اور اس کی پابندی ترک کرنے والوں کو اس طرح ملامت کرنا کہ گویا ان کے دین میں کوئی نقص آگیا ہے، بالکل ایک دوسری چیز ہے۔ پہلی چیز کے لیے تو شریعت میں پوری پوری گنجائش ہے، بلکہ خود صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کے طرز عمل سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے اور دین میں اس سے کوئی خرابی رونما نہیں ہوتی۔ لیکن دوسری چیز بعینہ وہ تفرق فی الدین ہے جس کی قرآن میں مذمت کی گئی ہے، اور اس تفرق کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ لوگ فقہی مسائل ہی کو اصل دین سمجھ بیٹھتے ہیں، پھر ان مسائل میں ذرا ذرا سے اختلاف پر ان کے درمیان الگ الگ امتیں بنتی ہیں، پھر ان فروعی بحثوں میں وہ اس قدر الجھتے اور ایک دوسرے سے بیگانہ ہو جاتے ہیں کہ ان کے لیے امت مسلمہ کی زندگی کے اصل مقصد (یعنی اعلائے کلمۃ اللہ اور اقامت دین) کی خاطر مل کر جد و جہد کرنا غیر ممکن ہو جاتا ہے۔

مسلک فقہی کے اعتبار سے کسی کا طریق اہل حدیث یا طریق حنفی یا طریق شافعی وغیرہ پر چلنا بجائے خود کسی قباحت کا موجب نہیں، لیکن اگر یہ چیز آگے بڑھ کر یہ صورت اختیار کر لے کہ مسلمان فی الحقیقت ایک امت نہ رہیں، بلکہ اہل حدیث، احناف، شوافع وغیرہ ناموں کے ساتھ الگ الگ مستقل امتیں بن جائیں، اور شرعی اعمال کی جو خاص صورتیں ان مختلف گروہوں نے اختیار کی ہیں وہ ہر ایک گروہ کے مخصوص شعائر قرار پا جائیں جن کی بنا پر ان گروہوں میں مغایرت اور امتیاز واقع ہو تو پھر یقیناً یہ دین کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہے اور میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ دین اسلام میں اس تقسیم اور تعصب کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ رفع یدین کرنا یا نہ کرنا، آمین زور سے کہنا یا آہستہ کہنا، اور ایسے ہی دوسرے امور صرف اسی وقت تک شرعی اعمال ہیں جب تک کوئی شخص ان کے ترک یا فعل کو اس بنا پر اختیار کرے کہ اس کی تحقیق میں حامل شریعت سے ایسا ہی ثابت ہے، یا یہ کہ ایسا کرنا دلائل شرعیہ کی بنا پر ارجح اور اولیٰ ہے۔ مگر جب یہی اعمال کسی مخصوص فرقے کے شعائر بن جائیں اور ان کا ترک یا فعل وہ علامت قرار پائے جس کی بنا پر یہ فیصلہ کیا جانے لگے کہ آپ کس فرقے میں داخل اور کس سے خارج ہیں اور پھر انہی علامتوں کے لحاظ سے یہ طے ہونے لگے کہ کون اپنا ہے اور کون غیر، تو اس صورت میں رفع یدین کرنا اور نہ کرنا یا آمین زور سے کہنا یا آہستہ کہنا یا ایسے ہی دوسرے امور کا ترک اور فعل دونوں یکساں بدعت ہیں اور بدترین قسم کی بدعت ہیں۔ اس لیے کہ سنت رسول اللہ میں بجائے خود تو ان اعمال کا ثبوت ملتا ہے، لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ ان اعمال کو مسلمانوں کے اندر گروہ بندیوں اور فرقہ سازیوں کے لیے علامات اور شعائر بنایا جائے۔ ایسا کرنا دراصل حدیث کا نام لے کر صاحب حدیث علیہ السلام کے منشا کے بالکل برعکس کام کرنا ہے اور اس اصل کام کو غارت کرنا ہے جس کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے تھے۔

۲- اب اس سلسلہ کی فقہی حیثیت کو لیجیے۔ رفع یدین کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پانچ مختلف طرزِ عمل منقول ہیں:

ا- ابن عمرؓ کی روایت جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ تین مواقع پر رفع یدین کرتے تھے۔ افتتاحِ صلوٰۃ کے وقت، رکوع میں جاتے ہوئے، اور رکوع سے اٹھ کر۔

ب- مالک بن حویرث کی روایت جس میں دو موقعوں پر رفع یدین کا ذکر ملتا ہے۔ افتتاحِ صلوٰۃ کے وقت اور رکوع سے اٹھ کر۔

ج- وائل بن حُجر کی روایت جس میں چار مواقع پر اس کا ہونا مذکور ہے۔ افتتاحِ صلوٰۃ کے وقت۔ رکوع میں جاتے ہوئے۔ رکوع سے اٹھتے ہوئے۔ سجدہ کے موقع پر۔

د- ابو حُمید ساعدی کی روایت، اس میں بھی چار مواقع پر رفع یدین کا ذکر ہے، مگر چوتھا موقع سجدہ کی بجائے تیسری رکعت میں قعدہ سے اٹھنے پر بیان کیا گیا ہے۔

ہ- عبداللہ ابن مسعود اور براء ابن عازب کی روایت جس میں صرف ایک مرتبہ رفع یدین کرنے کا ذکر ہے، یعنی افتتاحِ صلوٰۃ کے موقع پر۔

ان مختلف روایات میں سے (ا) کو امام شافعی، احمد، اور ابو ثور نے، نیز اہل الحدیث اور اہل الظاہر کی اکثریت نے اختیار کیا اور ایک روایت امام مالک سے بھی یہی ہے کہ وہ اس کو ترجیح دیتے تھے۔ (د) کو اہل الحدیث کے ایک گروہ نے مرجح ٹھہرایا۔ اور (ہ) کو ابراہیم نخعی، شعبی، سفیان ثوری، ابو حنیفہ اور تمام فقہائے کوفہ نے ترجیح دی۔ لیکن یہ واضح رہے کہ سوال صرف ترجیح کا ہے نہ کہ رد و قبول کا۔ ائمہ سلف میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ جن مختلف طریقوں کا ذکر مذکورہ بالا احادیث میں آیا ہے ان میں سے کسی پر حضورؐ نے عمل نہیں کیا تھا، بلکہ کہتے صرف یہ ہیں کہ جس خاص طریقہ کو ہم نے مرجح قرار دیا ہے وہ حضورؐ کا عام معمول تھا اور دوسرے طریقوں پر آپ کبھی کبھی عمل کر لیتے تھے۔ پس جب معاملہ کی حقیقت یہ ہے تو ان طریقوں میں سے جس پر بھی کوئی عمل کر رہا ہے، حدیث ہی کی پیروی کر رہا ہے اور اس پر نکیر کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ اتباعِ پیغمبر پر نکیر کی جاتی ہے جس کی جرأت مقلدین کو بھی زیبا نہیں چہ جائے کہ اہلِ حدیث اس کا ارتکاب کریں۔ پھر اگر کوئی شخص ان طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ پر جامد ہونے کے بجائے وقتاً فوقتاً ان سب طریقوں پر عمل کرتا رہے جو حدیث میں مذکور ہیں تو یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ صحیح و مکمل پیروی ہوگی، اور لفظ عمل بالحدیث کا اطلاق اس طرزِ عمل پر زیادہ صحیح معنی میں ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ابتدا ہی میں ایک طریقہ کو ترجیح دینے اور باقی سب طریقوں کو ترک کر دینے کے بجائے ان سب طریقوں کو نماز میں اختیار کرنے کی گنجائش رکھی جاتی تو شاید بعد کے ادوار میں وہ جمود و تعصب پیدا ہی نہ ہوتا جس کی بدولت نوبت یہ آگئی ہے کہ لوگ نماز کی جس صورت کے عادی ہیں اس سے ذرا سی مختلف صورت بھی جہاں انھوں نے دیکھی اور بس وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اس شخص کا دین بدل گیا ہے اور یہ ہماری امت سے نکل کر دوسری امت میں جا ملا ہے۔

یہ رائے جو میں عرض کر رہا ہوں یہ صرف میری انفرادی رائے ہی نہیں ہے بلکہ پہلے بھی متعدد اہلِ تحقیق اسی خیال کا اظہار کر چکے ہیں۔ اس وقت میرے پاس سفر میں کتابیں موجود نہیں ہیں .... اس لیے میں زیادہ وسیع

پیمانہ پر شواہد پیش نہیں کر سکتا، لیکن حجۃ اللہ البالغہ خوش قسمتی سے مل گئی ہے اس سے چند حوالے یہاں نقل کرتا ہوں۔ شاہ صاحب پہلے تو یہ اصولی بات ارشاد فرماتے ہیں کہ:-

الاصل ان یعمل بکل حدیث الا ان یمتنع العمل بالجمیع للتناقض (باب القضاء فی الاحادیث المختلفۃ)

اصولی بات یہ ہے کہ آدمی ہر حدیث پر عمل کرے، الا یہ کہ کسی مسئلہ میں سب حدیثوں پر عمل کرنا تناقض کی وجہ سے غیر ممکن ہو۔

پھر آگے چل کر فصل فی عدۃ امور مشکلۃ من التقلید واختلاف المذاہب میں فرماتے ہیں:-

ان اکثر صور الاختلاف بین الفقہاء لا سیما فی المسائل التی ظہر فیہا اقوال الصحابۃ فی الجانبین کتکبیرات التشریق وتکبیرات العیدین ونکاح المحرم وتشہد ابن عباس وابن مسعود والاخفاء بالبسملۃ وبآمین والاشفاع والایتار فی الاقامۃ ونحو ذلک، انما ہو فی ترجیح احد القولین وکان السلف لا یختلفون فی اصل المشروعیۃ وانما کان خلافہم فی اولی الامرین ونظیرہ اختلاف القراء فی وجوہ القراءۃ وقد عللوا کثیرا من ھذا الباب بان الصحابۃ مختلفون وانہم جمیعا علی الہدی۔

واقعہ یہ ہے کہ فقہا کے درمیان اختلاف کی اکثر صورتیں بالخصوص ان مسائل میں جس میں صحابہ کے اقوال دونوں طرف پائے جاتے ہیں، مثلاً تکبیراتِ تشریق، تکبیرات عیدین، نکاح مُحرم، تشہد ابن عباس وابن مسعود، بسم اللہ اور آمین کا اخفاء، تکبیراتِ اقامت میں کلمات کو ایک ایک مرتبہ یا دو دو مرتبہ پڑھنا وغیرہ، ان میں اختلاف دراصل اس امر میں ہے کہ دو اقوال میں سے کس کو کس پر ترجیح ہے ورنہ ان مختلف طریقوں کے بجائے خود مشروع ہونے میں سلف کے درمیان کوئی اختلاف نہ تھا۔ ان کا اختلاف تو صرف اس اعتبار سے تھا کہ دو مختلف امور میں سے اولیٰ کون سا ہے، اور یہ اختلاف ایسا ہی ہے جیسے قرأت کی مختلف صورتوں میں قاریوں کے درمیان اختلاف ہے اس معاملہ میں بیشتر امور کے اختلاف کی وجہ سلف نے یہ بتائی ہے کہ صحابہ کرام خود ان میں مختلف تھے اور ظاہر ہے کہ صحابہ سب کے سب ہدایت پر تھے۔

پھر باب اذکار الصلوٰۃ وہیاٰتہا المندوب الیہا میں فرماتے ہیں:-

وھو (ای رفع الیدین) من الہیآت وفعلہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم مرۃ وترکہ مرۃ والکل سنۃ واخذ بکل واحد جماعۃ من الصحابۃ والتابعین ومن بعدہم وھذا احد المواضع التی اختلف فیہا الفریقان اہل المدینۃ والکوفۃ ولکل واحد اصل اصیل والحق عندی فی مثل ذلک ان الکل سنۃ

اور وہ (یعنی رفع یدین) نماز کی ان ہیئتوں میں سے ہے جن کو نبی صلعم نے کبھی کیا ہے اور کبھی نہیں کیا، اور یہ دونوں طریقے سنت ہیں، صحابہ اور تابعین اور ان کے بعد کے لوگوں میں سے ایک ایک جماعت نے ان میں ایک ایک طریقے کو اختیار کیا ہے، اور یہ من جملہ ان معاملات کے ہے جن میں اہل مدینہ اور اہل کوفہ کے درمیان اختلاف واقع ہوا ہے، لیکن ہر ایک کے لیے ایک ثابت شدہ اصل شریعت میں موجود ہے اور ایسے مسائل میں میرے نزدیک حق یہ ہے کہ سب مختلف طریقے یکساں سنت ہیں۔

شاہ صاحب کی ان تصریحات کے بعد اس امر کی ضرورت نہیں رہتی کہ میں آمین کے مسئلہ کے متعلق الگ بحث کروں۔ تاہم اس معاملہ میں صاحب البحر الرائق کا یہ قول نقل کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ:-

والصواب ان الجمع بین بالجہر بہا والمخافتۃ — اور صحیح یہ ہے کہ آمین زور سے کہنے اور آہستہ کہنے، دونوں کی روایتیں صحیح
صحیحان وعمل بکل من فعلیہ جماعۃ من العلماء — ہیں اور ان میں سے ہر ایک پر علماء کی ایک ایک جماعت نے عمل کیا ہے۔

۳۔ ہماری جماعت کا ان اختلافی معاملات میں جو مسلک ہے اس کی توضیح اس سے پہلے بارہا کی جا چکی ہے، اور میں اب ایک مرتبہ پھر اسے صاف صاف الفاظ میں بیان کیے دیتا ہوں۔ اس جماعت میں اہل حدیث، احناف، شوافع اور ایسے ہی دوسرے فقہی طریقوں پر چلنے والے مسلمانوں کے لیے اپنے اپنے فقہی مسلک پر عمل کرنے کی پوری آزادی ہے، بشرطیکہ وہ ان مسلکوں میں سے کسی کے لیے متعصب نہ ہوں اور ان اختلافات کو منافرت اور جتھہ بندی کا ذریعہ نہ بنائیں۔ جماعت کے اندر جو لوگ بھی شامل ہوں انھیں اسلامی عصبیت کے سوا اور ساری عصبیتیں اپنے اندر سے نکالنی ہوں گی خواہ وہ وطنی عصبیتیں ہوں، نسلی ہوں، طبقاتی ہوں یا گروہی۔ ان کو محبت اور دوستی کے رشتہ میں جوڑنے والی چیز اسلام کے سوا اور کوئی نہ ہو، اور ان کے اندر غصہ و نفرت کو بھڑکانے والی بھی اسلام سے دوری کے سوا کوئی دوسری چیز نہ ہو۔ کسی رکن جماعت کے لیے کسی دوسرے شخص کا اہل حدیث یا حنفی یا شافعی مسلک پر ہونا یا اختیار کر لینا نہ تو سبب محبت ہی ہو اور نہ سبب نفرت۔ اس لازمی و ضروری شرط کے ساتھ اہل حدیث اہل حدیث رہتے ہوئے اور حنفی حنفی رہتے ہوئے اور شافعی شافعی رہتے ہوئے جماعت اسلامی کا رکن ہو سکتا ہے۔ لیکن جو شخص کسی مخصوص فقہی مذہب کے لیے متعصب ہو، اور اپنے مذہب کے پیروؤں سے محبت اور دوسرے طریقے والوں سے نفرت رکھتا ہو، اور حنفی، شافعی یا اہل حدیث ہو جانے کو جرم سمجھتا ہو اس کے لیے ہماری اس جماعت میں کوئی جگہ نہیں۔

۴۔ میرے متعلق اس نزاع کے سلسلہ میں جو کچھ کہا گیا ہے اُس پر میں صبر کرتا ہوں اور ان لوگوں کے معاملہ کو خدا پر چھوڑتا ہوں جنھوں نے بغیر علم و تحقیق کے یہ بدگمانی لوگوں میں پھیلائی کہ میں اہل حدیث کو حنفی بنانے کی سازش کر رہا ہوں۔ کاش وہ لوگ جو فقہی جزئیات میں کتاب و سنت کی پیروی پر بڑا زور دیا کرتے ہیں، اخلاقی معاملات میں بھی کتاب و سنت کی کچھ پیروی کر لیا کریں۔

۵۔ آپ کے والد ماجد نے اس قضیہ میں جو رویہ اختیار کیا ہے اس کی دو حیثیتیں ہیں، ایک رکن جماعت ہونے کی حیثیت سے اور ایک آپ کے والد ہونے کی حیثیت سے۔ جہاں تک پہلی حیثیت کا تعلق ہے اس پر میں نمبر ۳ میں روشنی ڈال چکا ہوں لہٰذا وہ براہ کرم اپنے متعلق فیصلہ کر لیں کہ آیا وہ اپنے رویہ کو بدلنا پسند فرماتے ہیں یا جماعت سے علیحدگی۔ رہی دوسری حیثیت، تو اس کے متعلق میں مختصر طور پر صرف یہ کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ جہاں تک اصول دین کا تعلق ہے، والدین کو نہ صرف یہ حق ہے بلکہ یہ ان کا فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اعتقادی ضلالت یا اخلاقی فساد سے روکنے کی کوشش کریں۔ لیکن جہاں تک فقہی معاملات کا تعلق ہے، والدین کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اولاد کو اپنے مسلک خاص کی پیروی پر مجبور کریں۔ خصوصاً جبکہ اولاد صاحب علم ہو اور تحقیق کی بنا پر والدین سے مختلف کسی دوسرے مسلک فقہی کو اختیار کرنا چاہتی ہو تو والدین کے لیے یہ مطالبہ کرنا کسی طرح درست نہیں ہے کہ وہ اپنی تحقیق کے خلاف عمل کرے۔ اس معاملہ میں سلف کا صحیح اتباع یہ ہے کہ والدین اور اولاد دونوں کو تحقیق کی آزادی اور اپنی تحقیق پر عمل کرنے کا حق ہونا چاہیے۔ اس حق کو سلب کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر ایک شخص اہل حدیث یا حنفی یا شافعی ہو تو وہ اپنی آئندہ نسل کو بھی اہل حدیث، حنفی، یا شافعی بنانے پر اصرار کرے گا اور دو چار پشتیں گزر جانے کے بعد

یہ طریقے محض فقہی مسلک نہ رہیں گے، بلکہ نسلی امتیں بن جائیں گی جن میں تعصب ہوگا، جمود ہوگا اور آبائی مسلک سے ہٹنا ارتداد کا ہم معنی قرار پائے گا۔ آپ خود ہی اپنے والد ماجد سے دریافت فرمالیں کہ آیا وہ اپنی آئندہ نسل کو اس فتنہ میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں؟

سفر میں قصر صلوٰۃ

سوال:- (ا) قصر صلوٰۃ انگریزی میلوں کے حساب سے کتنے لمبے سفر میں واجب ہے؟

(ب) کیا یہ فاصلہ یک طرفہ سفر کے لیے ہے یا آمد و رفت کی دوہری مسافت بھی شمار ہوگی؟

(ج) کیا ایک مقررہ حلقہ میں سفر کرنے پر بھی یہ رعایت حاصل ہوگی؟

جواب:- (ا) فقہا کی آرا اس معاملہ میں مختلف ہیں۔ چنانچہ قصر صلوٰۃ کے لیے کم از کم ۹ میل اور زیادہ سے زیادہ ۴۸ میل کا نصاب سفر مقرر کیا گیا ہے۔ اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ آنحضورؐ سے اس معاملہ میں کوئی صریح ارشاد منقول نہیں ہے، اور نص صریح کی غیر موجودگی میں جن دلائل سے استنباط کیا گیا ہے۔ ان کے اندر مختلف اقوال کی گنجائش ہے۔ صحیح یہ ہے کہ قصر کے لیے مسافت کا ایسا تعین جس میں ایک نقطۂ خاص سے تجاوز کرتے ہی قصر کا حکم لگایا جاسکے شارعؑ کا منشا نہیں ہے، شارع نے "سفر" کے مفہوم کو عرف عام پر چھوڑ دیا ہے اور یہ بات ہر شخص خود بآسانی جان سکتا ہے کہ کب وہ سفر میں ہے اور کب سفر میں نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم اگر شہر سے تفریح کے لیے نکلتے ہیں یا گاؤں سے خرید و فروخت کے لیے شہر جاتے ہیں تو کبھی بھی مسافر ہونے کا احساس ہمارے ذہن میں نہیں ہوتا۔ بخلاف اس کے جب واقعۃً سفر درپیش ہوتا ہے تو ہم مسافرت کی کیفیت خود محسوس کرتے ہیں۔ اسی احساس کے مطابق قصر اور اتمام کیا جاسکتا ہے۔ البتہ یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ شرعی معاملات میں صرف اس شخص کا فتوائے قلب معتبر ہے جو شریعت کی پابندی کا ارادہ رکھتا ہو نہ کہ بہانہ بازی کا۔

(ب) اس حصہ کا جواب اوپر ہی کی سطور میں موجود ہے۔ ویسے جن فقہا نے مقدار سفر مقرر کرنے کی کوشش کی ہے، ان کے پیش نظر یک طرفہ مسافت تھی۔

(ج) ہاں، مقررہ حلقہ میں سفر کرنے کی شکل میں بھی قصر صلوٰۃ کرنا چاہیے جس طرح اس حلقہ سے باہر کے سفروں کے دوران میں۔

ہندوستان میں گائے کی قربانی کا مسئلہ

سوال:- مسلمان قوم اگر ہندوستان میں گائے کی قربانی کو روک دے تو اسلام کی نگاہ میں کوئی قباحت نہیں آجاتی خصوصاً جب کہ اس فعل میں نفع کم اور نقصان زیادہ ہے۔ پھر کیوں نہ ایک ہمسایہ قوم کا اتحاد حاصل کرنے کے لیے رعایت سے کام لیا جائے؟ اکبر اعظم، جہانگیر، شاہ جہاں اور موجودہ نظام حیدر آباد نے عملی مثالیں اس سلسلہ میں قائم کی ہیں۔

جواب: آپ نے جن بڑے بڑے "اماموں" کا نام لیا ہے، افسوس ہے کہ مجھے ان میں سے کسی کی تقلید کا شرف حاصل نہیں ہے۔ میرے نزدیک مسلمانوں نے ہندوستان میں ہندوؤں کو راضی کرنے کے لیے اگر گائے کی قربانی ترک کی تو چاہے وہ کائناتی قیامت نہ آجائے جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے، لیکن ہندوستان کی حد تک اسلام پر واقعی قیامت تو ضرور آجائے گی۔ افسوس یہ ہے کہ آپ لوگوں کا نقطۂ نظر اس مسئلہ میں اسلام کے نقطۂ نظر کی عین ضد ہے۔ آپ کے نزدیک اہمیت عرض اس امر کی ہے کہ کسی طرح دو قوموں کے درمیان اختلاف و نزاع کے اسباب دور ہو جائیں، لیکن اسلام کے نزدیک اصل اہمیت یہ امر رکھتا ہے کہ توحید کا عقیدہ اختیار کرنے والوں کو شرک کے ہر ممکن خطرہ سے بچایا جائے۔

جس ملک میں گائے کی پوجا نہ ہوتی ہو اور گائے کو معبودوں میں شامل نہ کیا گیا ہو اور اس کے تقدس کا بھی عقیدہ نہ پایا جاتا ہو، وہاں تو گائے کی قربانی محض ایک جائز فعل ہے جس کو اگر نہ کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے، لیکن جہاں گائے معبود ہو اور تقدس کا مقام رکھتی ہو، وہاں تو گائے کی قربانی کا حکم ہے، جیسا کہ بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا تھا۔ اگر ایسے ملک میں کچھ مدت تک مسلمان مصلحتاً گائے کی قربانی ترک کر دیں اور گائے کا گوشت بھی نہ کھائیں تو یہ یقینی خطرہ ہے کہ آگے چل کر اپنی ہمسایہ قوموں کے گاؤ پرستانہ عقائد سے وہ متاثر ہو جائیں گے اور گائے کے تقدس کا اثر ان کے قلوب میں اسی طرح بیٹھ جائے گا جس طرح مصر کی گاؤ پرست آبادی میں رہتے رہتے بنی اسرائیل کا حال ہوا تھا کہ "اُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ"۔ پھر اس ماحول میں جو ہندو اسلام قبول کریں گے وہ چاہے اسلام کے اور دوسرے عقائد قبول کر لیں، لیکن گائے کی تقدیس ان کے اندر بدستور موجود رہے گی۔ اسی لیے میں ہندوستان میں گائے کی قربانی کو واجب سمجھتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی میرے نزدیک کسی نو مسلم ہندو کا اسلام اس وقت تک معتبر نہیں ہے جب تک وہ کم از کم ایک مرتبہ گائے کا گوشت نہ کھائے۔ اسی کی طرف وہ حدیث اشارہ کرتی ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ "جس نے نماز پڑھی جیسی ہم پڑھتے ہیں اور جس نے اسی قبلہ کو اختیار کیا جو ہمارا ہے اور جس نے ہمارا ذبیحہ کھایا وہ ہم میں سے ہے۔" یہ "ہمارا ذبیحہ کھایا" دوسرے الفاظ میں یہ معنی رکھتا ہے کہ مسلمانوں میں شامل ہونے کے لیے ان اوہام و قیود اور بندشوں کا توڑنا بھی ضروری ہے جن کا جاہلیت کی حالت میں کوئی شخص پابند رہا ہو۔

غیر محرم قریبی اعزہ سے پردہ کی صورت

سوال: کیا شوہر بیوی کو کسی ایسے رشتہ دار یا عزیز کے سامنے بے پردہ آنے کے لیے مجبور کر سکتا ہے جو شرعاً بیوی کے لیے غیر محرم ہو؟ نیز یہ بھی واضح فرمایئے کہ سسرال یا میکے کے ایسے غیر محرم قریبی رشتہ دار جن سے ہندوستانی نظام معاشرت کے تحت عموماً عورتوں میں پردہ کرنے کا رواج نہیں، ان سے پردہ کرنا چاہیے یا نہیں؟ اور اگر کرنا چاہیے تو کن حدود کے ساتھ؟

جواب: شوہر کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ خدا کے احکام کی خلاف ورزی پر بیوی کو مجبور کرے اور اگر وہ ایسا کرے تو مسلمان عورت کا فرض ہے کہ ایسے مطالبات پورے کرنے سے انکار کر دے۔

سسرال اور میکے میں عورتوں کا عموماً جن غیر محرم مگر قریبی رشتہ والوں کے ساتھ رہن سہن ہوتا ہے ان سے پردے کی نوعیت وہ نہیں ہے جو بالکل غیر مردوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ عورتیں ان کے سامنے بغیر زینت کے، سادہ لباس میں پورے ستر کے ساتھ آسکتی ہیں، مگر صرف اس حد تک ان کے سامنے رہنا چاہیے جس حد تک معاشرتی ضروریات کے لحاظ سے بالکل ناگزیر ہو۔ خلا ملا اور بے تکلفی اور ایک مجلس میں بیٹھ کر ہنسی مذاق اور تنہائی میں بیٹھنا اس قسم کے رشتہ داروں کے ساتھ جائز نہیں ہے۔

اس معاملہ میں فی الواقع ہماری معاشرت میں بڑی پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ اگرچہ شریعت کا جو حکم ہے، میں نے بتا دیا ہے لیکن مسلمانوں میں رواج سے جو غیر شرعی حالات پیدا ہو گئے ہیں ان کو دور کرنے کے لیے بڑی جرأت اور عزم کی ضرورت ہے۔ ایک طرف مسلمان غیروں سے اتنے پردے کا اہتمام کرتے ہیں جو کہیں کہیں خود شریعت کے مطالبات سے بڑھ جاتا ہے اور دوسری طرف رشتہ داروں کے معاملہ میں انھوں نے تمام حدود شرعیہ کو توڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس معاملہ میں شاید ہم کو کسی وقت ایسا سخت طرز عمل اختیار کرنا پڑے گا جس سے بعید نہیں کہ ہمارے خاندانی تعلقات میں بہت سی تلخیاں پیدا ہو جائیں)۔

تزکیۂ نفس کی حقیقت

سوال:۔ یہاں کی مقامی فضا تصوف کے چرچے سے معمور ہے۔ اس وجہ سے اکثر طرح طرح کے پیچیدہ مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اس وقت دو باتیں دریافت طلب ہیں:۔

(ا) تزکیۂ نفس کی صحیح تعریف کیا ہے؟ اس بارہ میں رسول اللہ کی تعلیم کیا تھی؟ متصوفین کا اس سلسلہ میں صحیح عمل کیا رہا ہے؟ نیز ایک مسلمان کو اپنی زندگی کے اس شعبہ میں کیا صورت اختیار کرنی چاہیے؟

(ب) کیا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی آج کل کے صوفیا کی طرح تزکیۂ نفس کیا کرتے تھے اور عالم بالا کے خواہشمند ہوتے رہتے تھے؟

جواب:۔ سوال کے پہلے جزو کے جواب میں یہ ذہن نشین کر لیجیے کہ عربی زبان میں تزکیہ کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے، ایک پاک صاف کرنا۔ دوسرے بڑھانا اور نشو و نما دینا۔ اس لفظ کو قرآن مجید میں بھی انہی دونوں معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ پس تزکیہ کا عمل دو اجزاء سے مرکب ہے۔ ایک یہ کہ نفس انسانی کو انفرادی طور پر اور سوسائٹی کو اجتماعی طور پر ناپسندیدہ صفات اور بری رسوم و عادات سے پاک صاف کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ پسندیدہ صفات کے ذریعے اس کو نشو و نما دیا جائے۔

اگر آپ قرآن مجید کو اس نقطۂ نظر سے دیکھیں اور حدیث میں صرف مشکوٰۃ ہی پر اس خیال سے نظر ڈالیں تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں وہ کونسی ناپسندیدہ صفات ہیں جن کو اللہ اور اس کا رسول دور کرنا چاہتے ہیں اور وہ کونسی پسندیدہ صفات ہیں جن کو وہ افراد اور سوسائٹی میں ترقی دینا چاہتے ہیں۔ نیز قرآن و حدیث کے مطالعہ ہی سے آپ کو ان تدابیر کی بھی پوری تفصیل معلوم ہو جائے گی جو اس غرض کے لیے اللہ تعالیٰ نے بتائی ہیں اور اس کے رسول نے استعمال

میں ترجمان القرآن میں اس مسئلہ پر بہت تفصیل سے لکھ رہا ہوں۔ کچھ حصہ لکھ چکا ہوں اور کچھ حصہ آئندہ لکھنے والا ہوں۔ آپ اس سلسلہ کو بغور مطالعہ کریں تو آپ کو سوال کا پورا جواب مل جائے گا۔ یہاں اشارۃً یہی بتا سکتا ہوں کہ اہل تصوف میں ایک مدت سے تزکیۂ نفس کا جو مفہوم رائج ہو گیا ہے اور اس کے جو طریقے ان میں چل پڑے ہیں وہ قرآن وسنت کی تعلیم سے بہت ہٹے ہوئے ہیں۔

دوسرے جزو کا جواب یہ ہے کہ صحابہ کرام نے تو عالم بالا کے معاملہ میں صرف رسول کے اعتماد پر غیب کی ساری حقیقتوں کو مان لیا تھا اس لیے مشاہدے کی نہ ان کو طلب تھی اور نہ اس کے لیے انھوں نے کوئی سعی کی۔ وہ بجائے اس کے کہ پردۂ غیب کے پیچھے جھانکنے کی کوشش کرتے، اپنی ساری قوتیں اس جدوجہد میں صرف کرتے تھے کہ پہلے اپنے آپ کو اور پھر ساری دنیا کو خدائے واحد کا مطیع بنائیں۔

فہرست کتب مکتبہ جماعت اسلامی

تفہیمات	سے	اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر	عہ	سلامتی کا راستہ	۶ر	اسلام اور جاہلیت	۶ر
خطبات قسم اول	عجہ	تجدید و احیائے دین	عہ	اسلام کا نظریۂ سیاسی	۶ر	نشانِ راہ	۶ر
مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش	عجہ	پردہ غیر مجلد	عجہ	اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے	۶ر	جہاد فی سبیل اللہ	۶ر
" " حصہ دوم	عجہ	" مجلد	سے			نیا نظام تعلیم	۶ر
" " حصہ سوم	۱۲ر	روداد جماعت اسلامی حصہ اول	۹ر	انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل	۶ر	دستور جماعت اسلامی	۲ر
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	عہ	" حصہ سوم	عہ			ایک نہایت اہم استفتاء	۲ر
حقیقت توحید	عجہ	دینیات (انگریزی مجلد)	سے	اسلام کیا ہے (انگریزی)	عجہ	نیشنلزم اینڈ انڈیا (انگریزی)	۹ر

دیگر اداروں کی کتابیں

جو

مکتبہ جماعت اسلامی، دار الاسلام میں موجود ہیں

عبادت	۲ر	اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر	۶ر	اسلام کا سیاسی نظام اور نظام عالم	۸ر	تفسیر سورہ قیامہ	۸ر
خدا کی اطاعت کس لیے	۲ر	ایمان کی کسوٹی	۲ر	علما اور اسلام	۱۲ر	" سورہ لہب	۶ر
مسلمان کا بنیادی عقیدہ (بڑا چارٹ)	۲ر	کلمہ طیبہ کے معنی	۲ر	مسلمان کی پہچان	۵ر	" سورہ مرسلات	۵ر
" " (چھوٹا)	۱ر	حقیقت شرک	عجہ	نظام اطاعت کی تین کڑیاں	۴ر	" سورہ والتین	۶ر
خطبہ تقسیم اسناد	۲ر	اسلام اور اشتراکیت	عہ	مولانا سندھی کے افکار پر ایک نظر	عہ ۱۲ر	" سورہ شمس	۶ر
راہ عمل	۶ر	اسلامی نظام	عہ	ذہنی زلزلے	عجہ ۲ر	" سورہ عبس	۶ر

اقسام القرآن ۸ر

مطبوعات

براہین وحی مرتبہ محمد اقبال سلمانی صاحب، ۲۰۰ صفحات چھوٹا سائز، قیمت مجلد ۶ ملنے کا پتہ: مکتبۂ امت مسلمہ (ہند) امرتسر

یہ کتاب چند مختلف اہل قلم کے مضامین کا مجموعہ ہے جو نیاز صاحب فتحپوری مدیر "نگار" کے جواب میں لکھے گئے ہیں، نیاز صاحب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول اور ایک کبھی نہ جھوٹ بولنے والا بلند اخلاق انسان سمجھنے کے باوجود قرآن کو کلام الٰہی نہیں تسلیم کرتے اور اس کو رسول اللہ صلعم کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ نیاز صاحب جیسے "روشن خیال" اور "عقلیت پرست" انسان کے منہ سے، جو اپنی فکری ترکتازیوں کے سامنے خدا کی خداوندی سے بھی مرعوب نہیں ہوتا، اتنی مہمل اور غیر معقول بات کا نکلنا انتہائی حیرت کا موجب ہے۔ آپ رسول کو رسول اور بلند اخلاق اور صادق و مصدوق بھی قرار دیتے ہیں اور ساتھ ہی اس امر کا بھی یقین رکھتے ہیں کہ قرآن کلام خداوندی نہیں بلکہ رسول کے اپنے ذہن و دماغ کا نتیجہ ہے، حالانکہ قرآن میں جو چیز سب سے زیادہ واضح ہے وہ یہی ہے کہ رسول جو کچھ بھی قرآن کے نام سے لوگوں تک پہنچاتا ہے وہ اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا پیغام اور اسی کا اتارا ہوا کلام ہے۔ تو گویا آپ نعوذ باللہ زندگی بھر خدا پر افترا کرتے رہے اور ہر روز یہ جھوٹ بول کر لوگوں کو فریب دیتے رہے کہ یہ سب فرمودۂ خدا ہے، درانحالیکہ وہ سب اپنے ذہن و دماغ کا نتیجہ ہوتا تھا؟ کیا ایک بلند اخلاق اور سچے انسان کا یہی کیرکٹر ہوتا ہے؟

یہ عجیب "عقلیت" اور "روشن خیالی" ہے کہ ایک چیز کی صداقت پر آپ کا دل بھی نہیں ٹھکتا لیکن اس کے باوجود اس سے چمٹے رہنا آپ ضروری سمجھتے ہیں۔ موجودہ مادی تہذیب کی پیدا کی ہوئی ذہنی انارکی میں اگر کوئی شے قابل ستائش بھی تو صرف یہ کہ انسان اسی بات کو اپنائے جس پر اس کا ضمیر مطمئن ہو اور ان چیزوں کو علانیہ رد کر دے جن پر اس کو اطمینان نہ ہو۔ مگر اس تہذیب کے ہندوستانی پیرووں کا باطن اس ایک جوہر سے بھی محروم ہے۔ اسلام کے مسلّمہ اصولوں پر انھیں یقین نہیں مگر اس کے باوجود کچھ سیاسی، معاشرتی اور معاشی اغراض ہیں، جن کی خاطر وہ اپنی پیشانیوں پر اسلام کا لیبل چپکائے رہنے پر مجبور ہیں، اور ان میں اتنی جرأت نہیں کہ اسلام سے اپنے انقطاع کا اعلان کر دیں۔

اس کتاب کے شروع میں خود نیاز صاحب کے اقوال و دلائل بھی درج ہیں، ان کو پڑھ کر کوئی صاحب علم نیاز صاحب کی علمیت پر ماتم کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جو شخص "مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى" میں "هوىٰ" کا ترجمہ ہوائی باتیں کرے، بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا" میں "بِاَنَّ" کے معنی "جیسے" بتائے۔ "فِي لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ" کا ترجمہ "ایک تختی میں محفوظ ہے" کرے، اس کو قرآن حکیم کے اعجازی کلام پر رائے زنی کرنے کا کیا حق ہے؟ منافقین کے جس استدلال بالقرآن سے رسول نے امت کے لیے پناہ مانگی تھی، نیاز صاحب نے اس کی یہ ایک نمایاں اور تازہ مثال پیش کی ہے۔

اگرچہ ان مضامین میں ان کی ہفوات کا مکمل جواب موجود ہے مگر پھر بھی ضرورت ہے کہ اس کتاب کو نقلی اور عقلی دونوں

اعتبار سے اور زیادہ مدلل کرکے ان حلقوں میں پہنچانے کی سعی کی جائے جو نیاز صاحب کی خاص صید گاہ ہیں، یعنی کالجوں میں اور نئے تعلیم یافتہ گروہ کی نعم سے محروم حلقوں میں۔

مولانا سید سلیمان صاحب کا مقالہ اپنے دائرہ بحث کے لحاظ سے باعتبار نقل مفصل اور جامع ہے مگر ہم کو ان کی اس بات سے اتفاق نہیں کہ "إِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ میں "ایحا" کا لفظ بطور طنز کے آیا ہے۔ ... نہیں ہے بلکہ لفظ اپنے معنی کے بعض پہلوؤں سے مجرد کرکے خفیہ مشورہ ... معنی میں بولا گیا ہے۔ ڈاکٹر ناثر صاحب کا مضمون باوجود مختصر ہونے کے بہت پرمغز اور مفید ہے، مگر انھوں نے آخر میں "نئی روشنی کے علمبرداروں" کو جو مشورہ دیا ہے وہ بنیادی طور پر غلط ہے۔ یورپین مصنفین کے افکار اور "مذہبی تعلیمات" دونوں کو یکساں تنقید کا مستحق قرار دینا سخت ناانصافی ہے اور اس کے مشورے دینے کا مطلب یہ ہے کہ دین میں ایسا رخنہ پیدا کرنے کا سامان ہم پہنچایا جائے جس سے آئے دن نئے نئے نیاز نکلتے رہیں۔ دین کی تعلیم پر جرح و تعدیل اور بحث و تنقید ضرور کی جاسکتی ہے مگر اس کا مقام دائرۂ اسلام سے باہر ہے، اندر نہیں۔ اسلام کے اندر آنے کا مطلب تو یہ ہے کہ آدمی نے رسول کی تعلیمات کو بالکل برحق اور تنقید سے یکسر بالاتر تسلیم کرلیا ہے۔ اب اگر وہ ان میں غور و فکر کرے گا تو صرف مزید اطمینان قلب اور شرح صدر کے لیے، نہ کہ ان کی صحت اور سقم معلوم کرنے کے لیے۔ جس کسی کو ان کی صحت جانچنی ہو وہ اسلام کے دائرے سے باہر رہ کر اچھی طرح جانچ لے، پھر اگر اس کو ان کی صحت اور صداقت کا اطمینان ہوجائے تو اندر آئے۔ ورنہ باہر کا باہر ہی رہے۔

کتاب کے آخر میں ایک مضمون "مدیر البیان" کا بھی ہے جس میں حسب توقع لیکن بلاضرورت احادیث پر ... کی گئی ہے۔ احادیث کے بارے میں جماعت "امت مسلمہ" اور مدیر البیان کے خیالات کسی تعارف کے محتاج نہیں اور نہ ہی ترجمان کا مسلک اور اس کے دلائل کسی پر مخفی ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر یہ مضمون اس کتاب میں شامل نہ ہوتا یا وہ حصہ اس میں سے حذف کردیا جاتا جس میں روایات پر رد و قدح کی گئی ہے، تو اچھا ہوتا۔ اس طرح کتاب کی افادیت بے آمیز اور اس کی اشاعت وسیع تر ہوتی۔

علما اور اسلام تصنیف مولوی منظر الدین صاحب صدیقی بی۔ اے، ۸۲ صفحات۔ قیمت ۱۲؍

ملنے کا پتہ:۔ دار الاشاعت نشاۃ ثانیہ۔ جدید ملے پلی۔ حیدرآباد دکن۔

یہ مختصر رسالہ اس سے پہلے "علمائے کرام کا مستقبل" کے عنوان سے شائع ہوچکا ہے، جس کو اب نئی ترتیب اور ترمیم و اضافوں کے بعد دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ مولف کے طرز نگارش اور ان کی اسلامی فہم و بصیرت سے ناظرین ترجمان القرآن ناواقف نہیں ہیں۔ موصوف نے اس رسالہ میں اختصار کے ساتھ یہ بتلایا ہے کہ علمائے اسلام کا حقیقی منصب کیا ہے اور ایک ایسے دین کے علمبردار ہونے کی حیثیت سے، جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے، ان کا مقام کتنا بلند، ان کی ذمہ داریاں کتنی گراں اور ان کے فرائض کتنے متنوع ہیں۔ اس کے بعد مسلمانوں اور اسلام کی تاریخ کے مختلف ادوار پر ایک اجمالی تبصرہ کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ علما کس طرح بتدریج اپنے اس مقام سے علیحدہ اور اپنی ذمہ داریوں

سے غافل ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ آج ان کا قدم اپنی منزل اور شاہراہ منزل سے بالکل نا آشنا ہو کے رہ گیا ہے۔ حالانکہ نہ صرف اپنا فرض منصبی ہونے کی وجہ سے ان کو دین کی اقامت کی طرف متوجہ ہونا چاہیے بلکہ اس لیے بھی کہ اس دین — یعنی اس نظام زندگی کے سوا اور کوئی دوسرا نظام، پریشانیوں کی ماری ہوئی دنیا اور مظلوم انسانیت کے درد کا درماں نہیں ہو سکتا۔

امید ہے کہ عام خواندہ حضرات اور علمائے دین، سب کے لیے یہ چھوٹی سی کتاب مفید ثابت ہوگی۔ (م-ا)

اسلام اور سود | از جناب ڈاکٹر انور اقبال صاحب قریشی، ایم۔ اے۔ صدر شعبہ معاشیات، جامعہ عثمانیہ حیدر آباد۔ دکن۔

شائع کردہ: ادارۂ معاشیات، فاطمہ منزل، حمایت نگر، حیدر آباد، دکن۔ صفحات ۲۰۰ قیمت مجلد تین روپے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی آنکھیں جو جدید مغربی علوم کے اولین مشاہدہ سے خیرہ ہو گئی تھیں۔ کہیں کہیں اب اپنی اصل فطری حالت کی طرف لوٹ رہی ہیں۔ چنانچہ زیر نظر کتاب "اسلام اور سود" میں مرعوب ذہنیت کے آثار نہیں پائے جاتے یعنی ڈاکٹر قریشی صاحب نے سود کی لعنت کو اسلام کے اصول و ضوابط کی کھینچ تان کر کے "کار خیر" ثابت کرنے کے بجائے خود معاشیات مغرب کی روشنی میں انسانیت کے لیے وجہ فساد ثابت کیا ہے۔ جناب مؤلف چونکہ معاشیات دور حاضر کے مختلف مدارس فکر سے اچھی طرح روشناس ہیں اس وجہ سے وہ اپنے مقالہ کو نباہنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ادھر "اسلامیات" سے بھی قابل قدر حد تک واقفیت کا ثبوت دیا گیا ہے۔ اور کتاب کا دوسرا باب اس کی شہادت دیتا ہے، مگر درحقیقت موضوع جس محققانہ و مجتہدانہ دینی بصیرت کا متقاضی تھا، وہ اگر استعمال میں آئی ہوتی تو اس موضوع سے تعلق رکھنے والے مشہور سوالات زیادہ اطمینان بخش استدلال کے ساتھ حل ہو سکتے۔ مگر پھر بھی ہمارے نزدیک اس کتاب کی بہت قدر و قیمت ہے، اس وجہ سے کہ اس نے اسلامی معاشیات کے دائرہ میں "علمی تجدید" کا راستہ کھول کر ارباب تجدد کو بتا دیا ہے کہ مسلمانوں کی پیشقدمی کس سمت میں ہونی چاہیے۔ علاوہ بریں معاشی مسائل سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو اس کے مطالعہ سے مفید معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

مجموعہ مقالات علمیہ | مرتبہ و شائع کردہ: مجلس ادارت، حیدر آباد اکاڈمی، حیدر آباد، دکن۔ قیمت درج نہیں۔

حیدر آباد اکاڈمی کی طرف سے علمی مقالات کے چند مجموعے پہلے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اور اس وقت ساتواں مجموعہ ہمارے سامنے ہے جس میں پانچ مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین میں کوئی ایسا نہیں جو معلومات افزا نہ ہو، مگر گہری بات کہہ دینی ضروری ہے کہ لکھنے والوں کے خیالات کے گھوڑے کسی خاص متعین نقطۂ نظر کے کھونٹے سے بندھے ہوئے نہیں ہیں اس لیے ہر طرف منہ مار لیتے ہیں۔ نسخۂ مجموعہ کے سب سے اہم مضمون "حقائق حیات انسانی" کو ہم نے کچھ زیادہ توجہ سے پڑھا اور اس میں یہ دیکھا کہ کہیں تو اس میں مادیت نمودار ہو جاتی ہے اور کسی موقع پر "اسلام" کی خفیف سی چمک ظاہر ہو جاتی ہے اور کہیں دونوں خلط ملط نظر آتے ہیں۔ دیانتدار اہل قلم کو ہمارا مشورہ یہ ہے کہ وہ اپنے متعلق خوب سوچ کر یہ فیصلہ کر لیں کہ وہ مسلمان ہیں یا کچھ اور۔ پھر اگر وہ اپنی نظر میں مسلمان ثابت ہوں اور مسلمان ہی رہنا چاہیں تو براہ کرم اپنے "قلم" کو بھی مسلمان بنائیں!

ناصر جنگ شہید — از جناب رہبر صاحب فاروقی، صفحات ۱۸۷، قیمت عہ ـ ملنے کا پتہ :- بیرون یاقوت پورہ، املی بن، مکان نمبر ۱۳۵۱/۵، حیدر آباد، دکن۔

یہ کتاب نظام الملک آصف جاہ بانی سلطنت آصفیہ کے جانشین نواب میر احمد خاں نظام الدولہ کے سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ واضح رہے کہ دکن کی سیاسی تاریخ کو جو اہمیت تاریخ ہند میں حاصل ہے، کچھ ویسی ہی اہمیت تاریخ دکن میں ناصر جنگ کے دور کی ہے، لیکن اس دور کے بہت مجمل حالات تاریخوں میں ملتے ہیں۔ اچھا ہوا کہ اب جناب رہبر فاروقی نے مطالعہ و تحقیق کے بعد اس دور کے متعلق تفصیلی معلومات فراہم کر دی ہیں۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات یقیناً مؤلف کی کاوش کی داد دیں گے۔

آثار اقبال — مرتبہ جناب غلام دستگیر صاحب رشید، ایم، اے، عثمانیہ۔ شائع کردہ :- ادارۂ اشاعت اردو، حیدر آباد، دکن

قیمت :- مجلد تین روپے ۱۲ آنے

علامہ اقبال کی شخصیت اور ان کے کلام کو مختلف اہل قلم مختلف پہلوؤں سے نمایاں کرنے میں مصروف ہیں اور آئے دن اس سلسلہ میں تشریحی اور تنقیدی مقالات شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اخبارات اور رسائل کے فائلوں سے ایسے ہی کچھ دلچسپ اور معلومات افزا مقالات کو اس کتاب میں جمع کیا گیا ہے۔ ان مقالات کے لکھنے والوں میں نواب محمد بہادر خاں مرحوم، ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم، پروفیسر خواجہ عبد الحمید، مولانا اسلم جیراجپوری، ڈاکٹر میر ولی الدین، مولانا محمد علی مرحوم، پروفیسر رشید احمد صدیقی، مولانا نذیر الحق میرٹھی اور دوسرے ممتاز اصحاب شامل ہیں۔

جن لوگوں کو اقبال مرحوم سے دلچسپی ہے، ان کے لیے یہ کتاب قابل مطالعہ ہے۔

تعارف قرآنی — از جناب ایم عبد الرحمٰن خاں صاحب، چلیک، ملتان شہر۔

ناشر :- ایم ثناء اللہ خاں پبلشر اینڈ بک سیلر، ۲۶، ریلوے روڈ، لاہور، قیمت مجلد عہ

یہ کتاب اگرچہ کوئی اونچے درجہ کی محققانہ تالیف نہیں ہے، لیکن بہرحال چونکہ اس کا موضوع قرآن ہے اور قرآن کی بعض بصیرت افروز آیات کو اس میں ایک خاص نظم سے مرتب کر کے پیش کیا گیا ہے، اس وجہ سے کون مسلمان ہوگا جو اس کی پسندیدگی کا اظہار نہ کرے۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، یہ کتاب خود قرآن کی آیات کے حوالہ سے قرآن کی مختلف حیثیتوں کو متعین کر کے پیش کرتی ہے۔ مثلاً اس کے چند عنوان ملاحظہ ہوں :- قرآن نے اپنے لیے کونسے نام استعمال کیے؟ قرآن کب اور کس طرح اتارا گیا؟ قرآن کس زبان میں نازل ہوا؟ کیا قرآن پر ایمان لانا ضروری ہے؟ قرآن کے منکر کون ہیں؟ وغیرہ۔ ایسے استفہامی عنوانوں کے ماتحت توضیحی آیتیں مع ترجمہ مرتب کی گئی ہیں۔ کتاب عام خواندہ طبقہ کے لیے مناسب ہے۔ (ن ص)

اعلان

رسالہ ترجمان القرآن کے مندرجہ ذیل رسائل ہمارے دفتر میں موجود ہیں۔ جن اصحاب کو ضرورت ہو منگا سکتے ہیں۔ قیمت فی پرچہ ۸ر

سنہ ۵۲ھ :- صفر، جمادی الآخر، رجب، شوال، ذوالقعدہ، ذی الحجہ۔ سنہ ۵۳ھ صفر، رجب، شعبان، رمضان۔ سنہ ۵۴ھ :- شعبان، سنہ ۵۵ھ :- ربیع الثانی، رجب، شوال۔ سنہ ۵۶ھ شوال، سنہ ۶۰ھ شوال۔ ذی القعدہ، ذی الحجہ۔ سنہ ۶۱ھ رمضان، شوال۔ ذی القعدہ، ذی الحجہ۔ سنہ ۶۲ھ جمادی الاول، جمادی الآخر، رجب، شعبان، رمضان، شوال۔ سنہ ۶۳ھ ذی القعدہ، ذی الحجہ

سرورق رہبر پریس، لاہور میں چھپا